سہ ماہی

کاروان ادب

جلد نمبر-۲۴ | جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۱۷ء | شمارہ-۲

مجلس مشاورت

● مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی ● مولانا حافظ فضل الرحیم ● ڈاکٹر محمود الحسن عارف ● مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مشرفِ عام

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

صدر رابطہ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر

مدیر مسئول

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

مدیر تحریر

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی

مدیر معاون

ڈاکٹر تابش مہدی

مجلس ادارت

● مولانا نذر الحفیظ ندوی، لکھنؤ ● ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ ● ڈاکٹر شفیق احمد ندوی، دہلی ● مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی، بھٹکل

معاون انتظامی : مولانا اقبال احمد ندوی

-: زرتعاون :-

اس شمارہ کی قیمت: ۴۰ روپے، سالانہ برائے ہندوستان ۱۵۰ روپے پاکستان و بنگلہ دیش: ۳۰۰ روپے یا ۱۰ امریکی ڈالر ان کے علاوہ دیگر ممالک: ۴۰۰ روپے

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں

RABITA-AL-ADAB-AL-ISLAMI(INDIA)

-: صدر دفتر :- رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

Designed & Printed at : Mashhud Enterprises Lko. Mob. 9839133588, 9451947786

فہرست مضامین

پیغام	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۳
اداریہ اور فکری زاویہ	ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی	۵
احساسِ نارسائی (نعت)	اختر اقبال کمالی	۸

مقالات

شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال شاعر اصلاح وانقلاب	مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۹
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم (شکوہ اور جوابِ شکوہ کی روشنی میں)	مولانا محمد علاء الدین ندوی	۱۷
مولانا الطاف حسین حالی کی شاعری میں اجتماعی عوامل	ڈاکٹر محمد سمیع اختر	۲۸
لسان القوم حضرت صفی لکھنوی	مولانا سید ضیاء الحسن	۴۴
سلیمان خطیب-دکنی زبان کا نمائندہ شاعر	ڈاکٹر محمد انظر ندوی	۵۱
لالہ خونیں کفن فلسطین - اردو شاعری میں	ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی	۶۱

شعر و غزل

غزل	قمر جلال آبادی	۶۵
غزل	قیصر الجعفری	۶۶
غزل	محمد عبد الرؤف خیر	۶۷
حرفِ آرزو (نظم)	گلنار آفریں	۶۸

افسانہ

لٹتے رہیں گے کب تک؟	حسین صحرائی	۶۹

پیغام

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
صدر رابطہ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين ، و الصلاة و السلام على سيد المرسلين خاتم النبيين سيدنا محمد بن عبد الله الأمين و علىٰ آله وصحبه أجمعين .

اسلام انسانی زندگی کو خوبی اور ستھری زندگی کا انداز عطا کرتا ہے، اس طرح وہ ادب کو بھی ستھرا اور خوبی والا بناتا ہے۔ اور ادب ہونے کے تعلق سے اس کا ادب آدمی کے ذوقِ سخن میں کشش اور دل پسندی پیدا کر دیتا ہے۔ ادب کا لفظ اول اول انسانی اخلاق و عمل میں ستھرا پن اور خوبی ہونے ہی کو کہتے تھے۔ پھر بتدریج انسانی کلام میں اس صفت کے پیدا ہو جانے کو ادب کہنے لگے۔ اور اس کو اسلام کی طرف سے پوری تائید ملی۔ لہذا اگر اس کی صفت کی بنا پر اس کو ادب اسلامی کا نام دیا جائے تو کوئی غلط بات نہیں کہی جاسکتی۔

اسلام ایسا مذہب ہے جو انسانی زندگی کا جامع طریقۂ زندگی ہے۔ اس میں انسانی اعمال و احساسات و تقاضے سب آجاتے ہیں ۔ اس طرح ادب اسلامی صفت کے ساتھ صرف کسی ایک پہلو تک محدود نہیں ہے ، وہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو شامل ہے۔ اس طرح وہ وسیع اور حقیقت کا ادب ہے، وہ تمام پہلوؤں میں پایا جاسکتا ہے ۔ بس اس کی بتائی ہوئی احتیاط کا لحاظ کرنا ہوگا۔

ادب اسلامی کی یہ اصطلاح گذشتہ زمانے میں بعض حقیقت پسند اصحابِ ادب نے اس وقت

شروع کی جب ادب کو صرف لطف ولذت کے دائرے کے اندر محدود رکھا جانے لگا اور پروپیگنڈہ اس طرح کیا جانے لگا کہ اگر کلام انسانی میں اخلاقی ستھراپن نمایاں ہوجائے تو وہ ادب کہلانے کے لائق نہ سمجھا جائے گا۔ لہذا ضرورت محسوس کی گئی کہ اس غلطی کو دور کیا جائے اوراس کو صرف نظریاتی سطح پر ہی نہیں بلکہ عملی سطح پر مثالوں کے ذریعے سامنے لایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پیش روفت شروع ہوئی اور ایسے ادب کی بعض مثالیں سامنے لائی گئیں ۔ جماعتِ اسلامی کے ادب شناسوں کا اس میں حصہ رہا اور وہ برصغیر کے دائرے میں سامنے آیا۔

اسلامی ادب کی ضرورت واہمیت کو عالمی سطح پر لانے کی کوشش نمایاں طور پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ظاہر ہوئی جب انھوں نے اسلامی خوبی کے ادب کے عربی نمونے تاریخ اسلام کے سرمایۂ کلام ادبی سے جمع کر کے کتاب کی صورت میں پیش کیے۔ پھر ادب کی اسلامی صفت کے نقطۂ نظر کو پُر اثر اور عملی انداز میں دمشق کی المجمع العلمي کے المجلة العربية میں پیش کیا۔ پھر ان کو متعدد عرب ادبا سے تائید ملی اور یہ رائے بنی کہ اس کو واضح وعام کرنے کے لیے باقاعدہ ادارہ قائم کیا جائے جو لکھنؤ میں عالمِ عربی و ہندوستان کے ادیبوں کے اتفاق سے قائم ہوا۔ جس نے مقبولیت حاصل کی اور عالمی ادارے کی سطح پر عالمی رابطہ ادبِ اسلامی کے نام سے وجود میں آیا۔ جو ملک اور بیرونِ ملک میں سال میں کئی سیمینار منعقد کرتا ہے اوراس میں اسلامی ادب کی مثالیں پیش ہوتی ہیں۔ خود ہندوستان میں اس کے سالانہ سیمینار ۳۶ کی تعداد تک پہنچ چکے ہیں۔ رابطہ ادب کے یہ سیمینار ادب اسلامی کے جدید اور اہم موضوعات پر منعقد ہوتے ہیں اوران کے مضامین کا خلاصہ رابطہ کے سہ ماہی ترجمان ''کاروانِ ادب'' میں بھی پیش کیا جاتا ہے جو قارئین کی دلچسپی کا حامل ہوتا ہے۔

اداریہ اور فکری زاویہ

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی

رابطہ ادب اسلامی کے سالانہ اجتماعات

رابطہ ادبِ اسلامی کی تحریک دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلی۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں اس کی آواز گونجی۔ بڑے بڑے سیمینار منعقد ہوئے۔ اچھے شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ مقالات پڑھے گیے۔ عرب دنیا میں کئی اچھے نقاد ادیب اور شاعر سامنے آئے۔ ادبِ اسلامی کے عربی مجلّہ " **الأدب الإسلامي** " میں ان کی تحریریں شائع ہوئیں۔ لیکن ہندوستان میں یہ تحریک علماء و مدارس تک محدود رہی اور علماء و مدارس کے دوشِ ناتواں پر کاموں کا بڑا بوجھ ہے۔ عام طور پر انھیں اس کا وقت نہیں ملتا ہے کہ وہ اردو ادب کے بنیاد گذاروں کی کتابوں کا مطالعہ کریں۔ حالی کی کتاب ''مقدمۂ شعر و شاعری'' پڑھیں۔ محمد حسین آزاد کی '' آبِ حیات''، شبلی کی ''شعر العجم'' اور ''موازنۂ انیس و دبیر'' کا مطالعہ کریں۔ ادب کی دنیا میں اپنی جگہ بنانے کے لیے مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی اور صباح الدین عبدالرحمٰن، پروفیسر عبدالمغنی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ماہر القادری، نعیم صدیقی، ظفر احمد صدیقی جیسے علما کی ادبی کتابوں کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ مشاہیرِ ادب کی جدید تنقیدی اور ادبی کتابوں کو پڑھے بغیر عصرِ حاضر کے رجحانات سے آدمی واقف نہیں ہوسکتا ہے۔ ادبِ اسلامی کی تحریک کو مقبولیت عطا کرنی ہے تو ادب کی دنیا میں وسیع المطالعہ بننا ہوگا۔ اور ادب سے وابستگی کو بھی ایک دینی کام سمجھنا ہوگا۔ عہدِ حاضر میں فکری انحرافات سب سے زیادہ ادب کے ذریعے داخل ہوئے ہیں، اس لیے فکر و نظر کے انحراف کا مقابلہ کرنے کے لیے ادب کے سوادِ کوئے جاناں میں اترنا ہی ہوگا۔ ادب کے سیف و سناں کو آزمانا ہوگا۔ اس کے لیے بڑی وسیع تیاری کی ضرورت ہے۔ وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے۔ ادب کی دنیا میں تیاری کے ساتھ آنے کی ضرورت ہے۔

رابطہ ادبِ اسلامی کی طرف سے سالانہ کل ہند سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں۔ مقامی شاخیں بھی پروگرام منعقد کرتی ہیں۔ ان سب کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی عقیدے سے وابستہ تعمیری شعور رکھنے والے حضرات کے ہاتھ میں ادب کی

زمامِ کار آئے۔ اچھے شاعر، اچھے نثر نگار، اچھے افسانہ نگار، اچھے نقاد اسلامی ذہن وفکر کے لوگ ہوں جو ادب میں اباحیت، تخریب پسندی اور الحاد کا مقابلہ کرسکیں۔ ادیب اور شاعر کو ادبی انداز میں سماج کی خرابیوں پر تنقید کرنی چاہئے۔ لیکن اگر کوئی ادیب اور شاعر سماج کی برائیوں اور خرابیوں کی طرف دعوت دے اور ان میں کشش پیدا کرنے کی کوشش کرے تو یہ ادب کا غلط استعمال ہے۔ رابطہ ادب اسلامی کی تحریک ادب وشعر کے غلط استعمال کے خلاف ایک جہاد ہے۔ ادب وشعر معمولی درجے کی چیز نہیں ہے۔ اس کا صحیح استعمال بھی ہوتا ہے اور غلط استعمال بھی ہوسکتا ہے۔ ایک ادیب وشاعر اور دانشور راہبر بھی ہوسکتا ہے، راہزن بھی ہوسکتا ہے۔ وہ راحتِ جاں بھی ہوسکتا ہے، آفتِ ایماں بھی ہوسکتا ہے۔ وہ اپنے منصب کے لحاظ سے سماج کا مصور بھی ہے اور سماج کا مصلح بھی ہے۔ وہ سماج کا لسانِ ناطق بھی ہے، وہ سماج کا حکیمِ حاذق بھی ہے۔ شاعر اور ادیب اگر اپنے مقام اور اپنی ذمہ داری کو نہ سمجھے، اور حکیمِ حاذق کے بجائے نیم حکیم بن جائے یا اس کی تشخیص غلط ہوجائے اور وہ دوا کے بجائے سنکھیا کھلا دے تو مریض کا کام تمام ہوجائے گا۔ اگر شاعر وادیب کو خود ہی صحیح اور غلط کی تمیز نہ ہو اور اسے منزل کا پتہ نہ ہو تو بہتوں کی منزل کھوٹی کرسکتا ہے۔ وہ تعمیر کے بجائے تخریب کا ساتھ دے سکتا ہے۔ نور وظلمت کی کشمکش میں وہ ظلمت کا علم بردار بن سکتا ہے۔ اس لیے ادیبوں اور شاعروں اور دانشوروں کی برادری کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے حلقے کے کسی فرد کو بہکنے اور لڑکھڑانے نہ دیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی شاعر اور ادیب کی غلطی پر بھی حمیتِ جاہلیہ اس کے دفاع پر آمادہ کرے۔ ادیب کو اجتہاد کرنے سے اور نئی بات کہنے سے یا نئے انداز سے بات کرنے سے کسی سے نہیں روکا جائے گا، لیکن شر وفساد، فتنہ پروری اور فساد انگیزی اور بدی کی ترغیب کا نام اجتہاد نہیں ہے۔ یہ ادب نہیں ہے۔ محض ادب کی وردی پہن لینے سے ہر غلط کام کا لائسنس نہیں مل سکتا ہے۔

کسی کو غلط فہمی نہ ہو کہ ہم شعر وادب کے ذریعے وعظ وتبلیغ کی دعوت دے رہے ہیں یا وعظ وتبلیغ کو ادب قرار دے رہے ہیں۔ ادب کو ادب کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ ستاروں کو تابندگی اور چاند وسورج کو درخشندگی دینے والی ہستی کا انسان سے مطالبہ یہ ہے کہ اس کے کردار اور گفتار دونوں میں حسن و سلیقہ پایا جائے۔ ادب گفتار کے اسی سلیقے کا نام ہے۔ خود قرآنِ مجید فصاحت وبلاغت کے اعجاز کا نمونہ ہے۔ کوئی بھی تحریر اس وقت تک ادب نہیں قرار پائے گی جب تک کہ وہ زبان وبیان کی درستی اور فصاحت وبلاغت کے معیار کے مطابق نہ ہو۔ جہاں تک شعر وادب کے مواد ومعانی کا تعلق ہے، ادبِ اسلامی میں ایسی کوئی چیز نہیں رہنی چاہئے جو حقیقتِ مذہب کے مغایر ہو۔ مذہب کا مزاق، عقیدے کا استہزا، خدا کا انکار، اباحیت اور فحاشی کی گنجائش نہیں ہے۔ اسلامی ادب ہر وہ ادب ہے جس سے معاشرے میں خیر کے اقدار کا فروغ ہو۔ چاہے ذکر چشمِ غزال کا ہو یا پیکرِ غزل کا ہو۔ شرابِ طہور کا ہو یا آبِ انگور کا ہو۔

خودی کا ہو یا خدا کا ہو۔ کوئی موضوع ہو لیکن اخلاقی اقدار سے بغاوت نہ ہو۔ چونکہ انسانی زندگی میں تعمیر اور تخریب دونوں کے محرکات پائے جاتے ہیں اس لیے شعر و ادب کے میدان میں تعمیر کے محرک سے رشتہ قائم کرنا ضروری ہے۔ شاعر و ادیب کو حق اور باطل کی رزم گاہ میں خیر کا، حق اور حسن کا ساتھ دینا ہوگا نہ کہ شر اور بدی کی حمایت کرنی ہوگی۔ ادب جب اسلامی اقدار سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو وہ اسلامی ادب کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ چاہے اسے اسلامی ادب کا نام دیا جائے یا نہ دیا جائے۔ اسلامی ادب کے دائرے میں ہر صنف آجائیگی۔ غزل بھی اور افسانہ بھی۔ ناول بھی اور ڈرامہ بھی۔ ادب کی ہر صنف اس کی وسعت میں شامل ہے اور اس کے دائرے میں داخل ہے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ ادب کا رشتہ مذہب سے ہے، ''اسلامی ادب'' کی اصطلاح زیادہ قدیم نہیں ہے۔ دراصل عہدِ حاضر میں ادب کو مختلف نظریات کے ساتھ منسوب کیا جانے لگا، رومانی ادب، ترقی پسند ادب، وجودی ادب، ادبِ لطیف، اشتراکی ادب، جدیدیت کا ادب اور مابعد جدیدیت کا ادب، یہ اصطلاحیں مقبولِ خاص و عام ہوگئیں۔ لوگ ادب کے پردے میں اپنے نظریات و افکار کو پیش کرنے لگے۔ بہت سے نظریے ایسے تھے کہ دینِ اسلام سے متصادم تھے۔ لیکن چونکہ وہ ادب تھا اس لیے لوگ مسموم افکار میں بھی کشش محسوس کرنے لگے۔ کیونکہ ادب میں تاثیر ہے۔ قوتِ تسخیر ہے۔ وہ وسیلۂ تخریب بھی ہے اور وسیلۂ تعمیر بھی ہے۔ لفظوں میں جادو کا اثر ہے اور جملوں میں دارو کا زہر ہوتا ہے۔ حالات کی نزاکت نے اہلِ دین کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ ایسے ادب کے وکیل بن جائیں جو صالح ہو، حیا سوز نہ ہو، اسلام پسند ہو، خدا بیزار نہ ہو، وہ اصلاح کا ذریعہ ہو، فساد کا آلۂ کار نہ ہو۔ اسلامی ادب کی تحریک عالم گیر اور بین الاقوامی تحریک بن گئی۔ اور دنیا کے اسلام پسند ادبا اور شعرا نے اسلامی ادب کی قیادت متفقہ طور پر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے سپرد کر دی تھی۔ اور اب اس تحریک کی دنیا کے بہت سے ملکوں میں شاخیں ہیں اور مختلف زبانوں میں اس ادبی تحریک کے ترجمان شائع ہوتے ہیں۔ اور ہر جگہ اس رابطہ ادبِ اسلامی کے اجتماعات منعقد ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں ہر سال کسی نہ کسی شہر میں اس تحریک کی جانب سے سیمینار منعقد ہوتا ہے جس کی اطلاع اخباروں میں شائع ہوتی ہے۔

احساسِ نارسائی

(نعت)

اختر اقبال کمالی

مرے حبیبؐ ترے قرب کی تمنا سے
مری نظر میں کوئی شے عزیز تر بھی نہیں

تجھی سے لطف و کرم کا امیدوار بھی ہے
یہ دل کہ سوزِ تمنا سے بہرہ ور بھی نہیں

یہ سچ ہے عشق کا دعویٰ کرے تو کس منہ سے
جو دل وفا کے تقاضوں سے باخبر بھی نہیں

یہ عشق کیا ہے جسے تابِ سرفروشی کیا
مجالِ آہِ شب و گریۂ سحر بھی نہیں

ترے حضور میں کیا نذر دوں کہ لائقِ نذر
متاعِ دل بھی نہیں، دولتِ نظر بھی نہیں

نہ وہ قدم جو تری راہ سے بھٹک نہ سکے
جو دل کے داغوں کو دھودے وہ چشمِ تر بھی نہیں

نہیں متاعِ دلِ بے نوا کچھ اس کے سوا
یہ ادعائے غلامی کہ معتبر بھی نہیں

سرِ نیاز ترے نقشِ پا سے نامحرم
جبینِ شوق شناسائے سنگِ در بھی نہیں

رہِ طلب میں قدم آگے بڑھ نہیں سکتے
کہ طاقتِ خلشِ خارِ رہگزر بھی نہیں

بچھڑ کے تجھ سے دلِ مبتلا پہ کیا گذری
بیاں کروں تو یہ افسانہ مختصر بھی نہیں

متاعِ جاں تری فرقت میں ہوگئی تاراج
اور اس زیاں کی ابھی تک مجھے خبر بھی نہیں

تمام عمر بھٹکتے رہے ہیں میرے قدم
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں

دل و نظر پہ مسلط رہی ہیں مدت سے
وہ ظلمتیں جنھیں اندیشۂ سحر بھی نہیں

وہاں رہا ہوں میں سرگشتہ فکرِ درماں میں
جہاں کوئی مرضِ دل کا چارہ گر بھی نہیں

ہیں تری اک نگاہِ چارہ ساز کے طالب
یہ دل کے زخم کہ شایانِ نیشتر بھی نہیں

بس اس یقیں کا سہارا ہے گمرہی میں مجھے
ترے سوا کوئی منزل کا راہبر بھی نہیں

امید ہے تو تجھی سے کہ تیری چشمِ کرم
دلِ حزیں کی تمنا سے بے خبر بھی نہیں

شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال : شاعرِ اصلاح وانقلاب

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی
(مدیر البعث الاسلامی، ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

اقبال کی شاعری میں جرسِ بیداری

ناموس ازل را تو امینی تو امینی
دارائے جہاں راتو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی
صہبائے یقین درکش واز دیرگماں خیز
ازخوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
فریاد زافرنگ ودلآویزیٔ افرنگ
فریاد زشیرینی وپرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ زچنگیزیٔ افرنگ
معمار حرم ! باز بہ تعمیرِ جہاں خیز !
ازخوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے اس فارسی قصیدے میں بڑے دردوغم کے ساتھ امتِ اسلامیہ کی غفلت اور بے حیثیتی کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امت اپنی عظمت رفتہ پر مطمئن ہے اور اسلاف کے کارناموں پر فخر کے محل تعمیر کررہی ہے۔ وہ ذرا بھی جہدِ پیہم کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ گمنامی کی زندگی پر راضی اور جمود پر خوش ہے۔

اس منظر کو دیکھ کر علامہ اقبال کا پیمانۂ صبر لبریز ہوتا ہے۔ وہ امتِ مسلمہ کو نوع بنوع کے فتنوں اور ہمہ گیر سازشوں کے نرغے میں پاکر بے چین ہوجاتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کررہے ہیں کہ ان فتنوں کے شعلے دیارِ مقدسہ کو بھی اپنی زد میں لینا چاہتے ہیں اور قرونِ اولی کے عقائدی اور تہذیبی ڈھانچے کو یکلخت ختم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن موجودہ مسلمان ان حقائق سے غافل، لذت کوشی میں منہمک، اپنی ذات تک محدود، دشمنانِ اسلام کی تخریبی کارروائیوں سے بے بہرہ اور خطرات کے منڈلاتے بادل سے بے گانہ ہے۔

علامہ اقبال اس دلگداز منظر سے سخت کبیدہ خاطر تھے اور شمعِ محفل کی طرح پگھلتے تھے۔ ان کا شعری قریحہ (ذوق) بیدار ہوتا ہے۔ امید وبیم میں ڈوبی ہوئی پکار ان کے اندرون سے بلند ہوتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ غفلت کے شکار مسلمان کو بیدار کریں اور اس کے خلاف گہری سازشوں کے جال سے واقف کرائیں۔ وہ موجودہ مسلمان کو تعمیرِ جہاں اور قیادتِ دنیا کی طرف متوجہ کررہے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ وہ اپنے قائدانہ مقام کی طرف آئے گا اور تعمیرِ نو کا کام کرے گا۔

ان اشعار سے علامہ اقبال کی فکری بلندی، ذہنی وسعت، اور امتِ مسلمہ اور عالمِ اسلامی کے لیے جو دائمی پیغام رکھتے ہیں، کا اندازہ ہوتا ہے۔ علامہ اقبال زمانے کی رو میں بہنے والے اور حالات وواقعات سے شکست کھانے والے نہیں تھے کہ وہ اسی سمت رختِ سفر باندھ لیں جدھر ہوا کا رخ ہو، اور مصلحت کوشی اور نفع اندوزی کو اپنا وطیرہ بنالیں۔ ان کی شخصیت

کے تشکیلی عناصر میں ایمان وعقیدہ کی پختگی کو خاص دخل ہے۔ الہامی افکار کے سمندر میں اتر کر ایسے یاقوت وجواہر لے آئے جس سے ان کی شاعری دعوتِ فکر وعمل بن گئی اور زندگی ، انسان اور کائنات کی ترجمان ہوگئی۔

اقبال کی شاعری نکتۂ ایمان کی تفسیر

علامہ اقبال اپنے زمانے کے علوم وافکار اور تہذیب و تمدن سے پوری طرح باخبر تھے۔ انہوں نے اپنی روشن دماغی، وسیع المشربی اور کمیاب ذہانت سے امتِ مسلمہ کو درپیش مسائل کو بھانپ لیا تھا۔ اور پردے کے پیچھے سے اسلامی نقوش کو مٹانے ، اور عقائدی ڈھانچے کو منہدم کرنے والی کوششیں ان کی نگاہوں کے سامنے تھیں۔ چنانچہ متنوع رنگ وآہنگ اور متعدد ناموں اور عناوین سے ان کے شعری چشمے پھوٹے۔ کبھی انہوں نے مغربی تہذیب، اس کے نظامِ تعلیم کو نشانہ بنایا، اور کبھی اس کے تمدنی ، اخلاقی اور سیاسی فلسفے کے تار پود کو بکھیرا، تو کبھی کمیونزم، سوشلزم، ڈیموکریسی ، مارکسزم اور مادی نقطۂ نظر کی کھل کر مذمت کی۔ یہ اندازِ بیان ایسا مبصرانہ، مدبرانہ اور دانشمندانہ ہے کہ اس میں صدیوں کی تاریخ کا خلاصہ آ گیا۔ پھر اس تاریخ کو شعری قالب میں ڈھالا، جس سے انہوں نے تارِ نفس کو چھیڑا۔ غفلت کا پردہ چاک کیا۔ سوتوں کو جگایا۔ بجھے ہوئے ارادوں کو استحکام عطا کیا۔ ہمتوں کو حیاتِ نو دی اور شاعری میں ایسے حکیمانہ حقائق بیان کئے، جن تک رسائی طویل بحث وتحقیق کے بعد ہی ہوتی ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری معاصر دنیا کے حالات کی سچی تصویر اور نکتۂ ایماں کی واضح تفسیر ہے۔ انہوں نے جہاں ایک طرف انسانِ کامل کا مفہوم بتایا ہے، وہیں دوسری طرف اس کی نافعیت، میدانِ عمل، اور ہمہ وقت اس پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ گھر اور گھر کے باہر کس طرح رہے ، اس کا معاش ومعاد کیسا ہونا چاہئے، خلوت وجلوت کی زندگی کیسی ہونی چاہئے، اللہ اور لوگوں کے ساتھ کیسا تعلق ہونا چاہئے ، یہ وہ باتیں ہیں جن کی تفسیر کچھ دانشوروں نے غیر منصفانہ کی ہے۔ اس فکری انحراف سے بہت سے لوگوں کی زندگیاں صراطِ مستقیم سے دور ہوگئی ہیں۔

دیارِ غیر میں اقبال کی اسلامیت

حیرت کا مقام ہے کہ علامہ اقبال کی یہ اصابتِ رائے، اور اسلام کی گہری بصیرت، اور اس کے پیغام و دعوت کے لیے روشن ضمیری عصری تعلیم، اور یورپین اداروں میں اعلی تعلیم سے متاثر نہیں ہوئی۔ جب کہ قرینِ قیاس یہ بات تھی کہ وہ مغربی تہذیب کے دھارے میں بہہ جاتے۔ مادی فلسفے کی ترجمانی ان کا مشغلہ ہوتا۔ ان کی ساری توانائیاں اور علمی استعدادیں اسی ''آقا'' کی خدمت گاری میں صرف ہوتیں۔ اور وہ اسلام کے حق میں تیغِ بے نیام ہوتے۔ لیکن اللہ رب العزت کا یہ خاص انعام ہے کہ گہوارۂ کفر وضلالت میں رہتے ہوئے اس کے اثر سے مکمل طور سے محفوظ ہوئے۔ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نارِ نمرود سے سلامت نکلے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

عذاب دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

علامہ اقبال نے جیسے جیسے علوم وفنون میں ترقی کی، اور مادی نظامہائے زندگی، اور فلسفوں اور ازموں کا مطالعہ کیا، اور ان کی تہہ تک پہونچے اسلام کی حقانیت اور اس کے دائمی پیغام پر ان کا ایمان مضبوط ہوتا گیا۔ اور اسلامی عقیدہ اور ایمانیات پر ان کا دل مضبوط ہوا۔ اور اللہ تعالی سے ان کا رابطہ قوی سے قوی تر ہوا۔

چنانچہ انہوں نے راتوں کو آہ و وزاری میں گذارا۔ پورے اعضاء وجوارح کو ہر حال میں ذاکر وشاکر بنایا۔ مغربی تہذیب کے مراکز میں رہتے ہوئے ان کا دامن اس کی آلائشوں سے گندہ نہیں ہوا ۔کون ایسا مرد مجاہد ہے؟ جو اس میں اپنے لیے تحفظ کا سامان فراہم کرے؟ لیکن علامہ اقبال نے اس تصور کو عملی شکل دی۔ خاروں کے درمیان رہ کر ان سے الجھے نہیں۔ وہ ان دلفریبیوں اور آزاد خیالیوں میں ایک سچے موحد، پکے مومن، مثالی عاشق اور انسانِ کامل کی طرح رہے۔ اس ماحول میں کبھی ان کی قیام اللیل فوت نہیں ہوئی۔ وہ ایک شعر میں کہتے ہیں:

زمستانی ہوا میں گر چہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

علامہ اقبال اور عشق نبی

علامہ اقبال کا عشق نبی (ﷺ) مثالی تھا ، کیونکہ وہ رسول اللہ (ﷺ) پر ہمہ وقت اپنے جسم و جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار تھے۔ وہ انہیں کے ذکر میں کھوئے رہتے تھے ۔ان کے نام سے برکت حاصل کرتے تھے۔ اور اپنی سرگرمیوں اور مسائلِ زندگی میں نورانیت پیدا کرتے تھے۔ انہوں نے ذاتِ رسول (ﷺ) سے جس قدر وارفتگی اور محبت کا اظہار اپنے اشعار میں کیا ہے، وہ لائق تقلید ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے قلب وروح کو محبتِ نبوی سے آباد کیا تھا۔ مغربی ماحول میں محبتِ نبوی ہی ان کی اصل پونجی تھی۔ چنانچہ تہذیبوں کی چمک دمک نے ان کو ذرا بھی نقصان نہیں پہونچایا۔ انہوں نے اسی سرمایے سے باطل کے صنم کدوں کو زیر کیا۔ وہ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

ایک دوسرے قصیدے میں کہتے ہیں:

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ برفتراک صاحب دولتے بستم سر خود را
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں ، وہی فرقاں ، وہی یسیں وہی طہ

یہی پاکیزہ محبت ان کی تمام سرگرمیوں کو اوجِ ثریا پر پہونچانے والی تھی۔ اسی سے وہ شاعرانہ افکار اور معنوی قوت حاصل کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اس راہ کا غبار بننا پسند کرتے تھے۔

ایک فارسی قصیدے میں کہتے ہیں:

دردلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ماز نامِ مصطفیٰ است
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسری زیرِ پائے امتش
درشبستانِ حرا خلوت گزید
قوم وآئین و حکومت آفرید

عصر حاضر کے مشکلات کی اصل وجہ اقبال کی نظر میں

علامہ اقبال کے عصری تعلیم اور یورپین فلسفے ، اور معاشرت سے متعلق بیش قیمت آرا ہیں ۔انہوں نے پوری دیانتداری کے ساتھ اقوام وملل کی تاریخ کا مطالعہ کیا۔ فلسفیوں اور متکلمین کی تحقیقات کو بغور دیکھا۔ لیکن ان میں سے کسی سے مرعوب نہیں ہوئے ۔ان کی اپنی مستقل آرا وافکار ہیں جو طویل مطالعے کا نچوڑ اور نتیجہ ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ عصرِ حاضر میں مسائل ومشکلات کی جو کثرت ہے ، اس کی اصل وجہ فاسد

خیالات کا اسلامی معاشرے میں سرایت کرنا ہے۔ نئے ازموں اور فلسفوں نے معاشرے کو ایسی جکڑ بندیوں میں گھیر رکھا ہے کہ کبھی رنگ و نسل پر فتنے کھڑے ہوتے ہیں، تو کبھی قوم و ملت پر، لوگوں نے اپنے اپنے انداز سے شعور و لاشعور میں صنم تراش لیے ہیں۔ ان تمام رجحانات کا علامہ اقبال نے قلع قمع کیا ہے اور یورپ جو اپنے آپ کو علوم و فنون کا قائد اور تہذیبوں کا سرخیل تصور کرتا ہے، اس کی تہذیب کی قلعی کھولی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

اقبال کا انسانِ کامل

اقبال کا خیال ہے کہ آج دنیا کو انسانِ کامل کی ضرورت ہے۔ وہ جب دنیا کا نظام سنبھالے گا تو عدل و انصاف کا بول بالا ہوگا۔ شر و فساد کا خاتمہ ہوگا اور انسانیت امن و سکون کی زندگی گذارے گی۔ اقبال کی نگاہ میں انسانِ کامل سے مراد حقیقی مسلمان ہے۔ وہ مسلمان جو مکمل اسلام کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہی زمین میں خلافت کا حامل ہے۔ انسانِ کامل ہی زندگی کے تمام مسائل کو حل کرنے والا اور دنیا میں امن و امان کو پھیلانے والا ہے۔ اقبال نے ایک نظم لکھی ہے، جس کا عنوان ہے: فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں۔ اس میں کہتے ہیں:

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی
گرا ں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

ایک دوسری نظم کا عنوان ہے: روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے۔ اس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام کو خلافتِ ارضی کے لیے دنیا پر بھیجا اور ان کو غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا، تاکہ وہ اس کائنات میں پنہاں خوبیوں کو دریافت کر سکیں۔ پھر کائنات کو انسان سے جوڑا اور انسان کو کائنات سے وابستہ کیا۔ وہ کہتے ہیں:

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایامِ جوانی کے ستم دیکھ ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ
ہیں ترے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک ، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ ، یہ صحرا ، یہ سمندر ، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ
سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
نا پید ترے بحرِ تخیل کے کنارے

پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ
خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے، ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ
نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خونریز وکم آمیز ازل سے
ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

اقبال ان اشعار کے ذریعے انسان کو مخاطب کررہے ہیں۔اس کو اس کا مقام یاد دلا رہے ہیں۔ ذمہ داریوں سے واقف کرارہے ہیں اور عالمی قیادت کا جو منصب اس کے سپرد کیا گیا ہے،اوراس کو خیرامت کا جو ایک فرد بنایا گیااس سے آگاہ کررہے ہیں۔ کیونکہ انسان اگراس کوفراموش کردے گا،فکری زیغ وضلال کا شکار ہوگا۔اللہ تعالی نے انسان کواس کے مرتبہ سے قرآن کریم میں جابجا واقف کرایا ہے۔ سورۂ انفطار میں ہے:﴿ يأيها الإنسان ما غرك بربك الكريم ، الذي خلقك فسواك فعدلك ، في أي صورة ما شاء ركبك ، كلا ، بل تكذبون بالدين ، وإن عليكم لحافظين كراما كاتبين يعلمون ما تفعلون﴾ (٦-١٢) ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:﴿ وإذا أنعمنا على الإنسان أعرض ونأى بجانبه ، وإذا مسه الشر كان يؤوسا ﴾ (الإسراء:٨٣) مزید فرمایا: ﴿ أولم ير الإنسان أنا خلقناه ولم يك شيئا﴾ (مريم :٦٨) ایک دوسری جگہ ہے: ﴿ ولقد خلقنا الإنسان ونعلم ما توسوس به نفسه ونحن أقرب إليه من حبل الوريد﴾ (ق:١٦) ایک دوسری جگہ ہے : ﴿ وأن ليس للإنسان إلا ما سعى ، وأن سعيه سوف يرى ، ثم يجزاه الجزاء الأوفى ﴾ (نجم: ٣٩-٤١)۔

علامہ اقبال کائنات میں انسان کے مرتبے کی طرف اشارہ کررہے ہیں اور حقیقی انسان کے فقدان کا شکوہ بھی کررہے ہیں۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ''رجال الفکر والدعوۃ'' میں مولانا رومی کے تذکرہ میں اس موضوع کو تفصیل سے بیان کیا ہے،وہ کہتے ہیں:

حقیقی انسان کا وجود آج ویسے ہی مفقود ہے، جیسے پہلے تھا، یہاں تک کہ وہ عنقا ہوگیا ہے۔ محققین اور تلاش کرنے والے دیوجانس کے چراغ سے اس کو تلاش کررہے ہیں۔ مولانا رومی نے اپنے دیوان میں اس سے متعلق ایک واقعہ ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں: کل رات میں نے شہر میں ایک سن رسیدہ درویش کو دیکھا، وہ ہاتھ میں چراغ لیے کچھ تلاش کررہا تھا۔ میں نے کہا: جناب! کیا تلاش کررہے ہیں؟ فرمانے لگے کہ درندوں اور چوپایوں کی بستی میں رہتے ہوئے طبیعت عاجز ہوگئی ہے، اب انسان کو تلاش کرنے نکلا ہوں، میں ایسے لوگوں کو اپنے اردگرد پاتا ہوں جو انسان نہیں ہیں، میں نے کہا کہ جس انسان کو آپ تلاش کررہے ہیں، اس کا ملنا آسان نہیں، میں نے ایک زمانے تک اس کو تلاش کیا، لیکن نہیں پایا، انہوں نے جواب دیا: جب میں کسی چیز کو نہیں پاتا ہوں تو میری تلاش بڑھ جاتی ہے۔

علامہ اقبالؒ اپنے نظریۂ انسانِ کامل میں مولانا رومیؒ کے تلاشِ انسان سے متاثر ہوئے ۔ کیونکہ جو زمانہ علامہ اقبال نے پایا، وہ حقیقی انسان کے فقدان میں مولانا رومیؒ کے زمانے سے زیادہ مشابہ تھا۔ کیونکہ انسان صراط مستقیم سے بے گانہ ہوکر دیگر راستوں پر چل رہا تھا۔ خودغرضی، شخصی منفعت، قساوتِ قلبی کا غلبہ تھا، دنیا پرستی لوگوں کے ذہن ودماغ پر چھائی ہوئی تھی ۔ طاعت سے جی چرانے، عبادت سے دور رہنا، تعمیرِ آخرت کے لیے کام کرنا مفقود ہو چکا تھا۔ جب کہ آخرت کا مسئلہ ایسا لرزہ خیز ہوگا کہ اس دن مال ومنال، اور اولا د واسباب کچھ بھی کام نہیں آئیں گے۔

عربوں کی حالت اسلام سے پہلے

اقبال عربوں کے دورِ جاہلی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بعثتِ محمدی سے پہلے عربوں کا کوئی نظام نہ تھا، اور وہ فوضویت اور انارکی کے شکار تھے، ان کی زندگی جانوروں کی زندگی تھی اور کھانے پینے سے آگے ان کے سامنے زندگی کا کوئی اور مقصد نہ تھا۔ ان کی تلوار چمک دار ضرور تھی ،لیکن جوہر سے خالی اور کند تھی ۔ وہ اسلام سے پہلے اونٹوں کو چراتے تھے ،لیکن اسلام کے بعد دنیا کی جہاں بانی ان کے حصے میں آگئی اور ان کی تکبیر جہاد سے شرق وغرب گونج اٹھے:

حق ترا براں تراز شمشیر کرد
سارباں را راکب تقدیر کرد
کارِ خود را امتاں برد ند پیش
تو ندانی قیمتِ صحرائے خویش!
امتے بودی امم گر دیدۂ !
بزمِ خود را خود زہم پاشیدۂ
ہر کہ از بندِ خودی وارست مرد !
ہر کہ بابیگا نگاں پیوست ، مرد

اقبال کا مضرابِ اصلاح

عربوں کی شجاعتِ اسلامی اور للّٰہیت کی مدح کے بعد انھیں یہ منظر غمناک کر دیتا ہے ، جب وہ دیکھتے ہیں کہ عربوں میں اب نشاط کے بعد جمود و بے حسی ، وحدت کی جگہ تفرقہ ، قیادت کے بجائے تقلید و پسماندگی پیدا ہوگئی ہے، تو وہ انھیں دوستانہ عتاب کے ساتھ مخاطب کرتے اور کہتے ہیں:

تمہارے جمود وخموز پر ایک عالم افسوس کر رہا ہے کہ دوسری قومیں کس طرح تم سے آگے نکل گئیں، تم نے اپنے صحرا کی قدر نہیں کی ، اور اس کے پیغام کو بھلا دیا ہے۔ تم پہلے ایک ملت ، ملت مسلمہ تھے ،لیکن آج ٹکڑیوں اور گروہوں میں بٹ گئے ، پہلے حزب اللہ ہی تمہاری جماعت تھی ۔لیکن اب تمہاری جماعتیں بے شمار ہیں۔ عربوں کو معلوم نہیں کہ جو اپنی شخصیت اور حیثیت پر ظلم کرتا ہے، اور اعتمادِ نفس کھو دیتا ہے، وہ عالمِ وجود ہی سے مٹ جاتا ہے، اور جو اپنی چھاؤنی سے نکل کر دشمن کی پناہ ڈھونڈتا ہے، وہ ذلت وبدبختی اور محرومی وناکامی کا منہ دیکھتا ہے، اور عربوں کا دشمن ان سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ، انہوں نے خود اپنے ساتھ ناانصافی کی ،اور روح رسولِ عربی (ﷺ) کو تکلیف دی ہے، نبی (ﷺ) کی روح آج امتِ عربیہ سے شکوہ سنج اور گلہ گذار ہے:

آنچہ تو باخویش کردی کس نکرد
روحِ پاکِ مصطفیٰ آمد بدرد!
اے ز افسونِ فرنگی بے خبر
فتنہ ہا در آستینِ او نگر !

حکمتش ہر قوم را بے چارہ کرد
وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد
تا عرب در حلقۂ دامش فتاد
آسماں یک دم اماں اورانداد

شاعر افرنگ کے مکر وفریب ، اس کے خطرناک منصوبوں اورارادوں کوخوب سمجھتا ہے۔اس لیے کہ اسے اس نے قریب سے رہ کر دیکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ عربوں کوخوش گمانی میں مبتلا دیکھ کر قدرتی طور پر تکلیف محسوس کرتا ہے اوران کی اس سادہ لوحی اور زود اعتمادی پر فریاد کرتا ہے کہ وہ انھیں اپنا نجات دہندہ اورمشکل کشا سمجھتے ہیں۔وہ انھیں مخاطب کر کے کہتے ہیں:

نادانو!عقل کے ناخن لو!تم فرنگ پر اعتماد کررہے ہو ،لیکن اسکے پوشیدہ عزائم کی تمہیں خبر نہیں۔تمہیں معلوم نہیں کہ سحر فرنگ نے کتنوں کومردِ بیمار اور مجبور وگرفتار بنا کر رکھ دیا ہے۔ تمہیں نظر نہیں آتا کہ سحرِ فرنگ نے تمہاری وحدت ختم کر کے بیسیوں حکومتیں بنادیں،اور جنگوں میں ان کا کُل سرمایہ لوٹ کر ایسا غارت کیا کہ کوئی غم خوار بھی نہیں ملا۔

اس کے بعد عربوں کونشأۃ ثانیہ کے لیے ابھارتے ہوئے کہتے ہیں:تمہیں اللہ نے جوبصیرت دی ہے،اس سے کام لو،اوردبی ہوئی چنگاری کوشعلۂ جوالہ بنادو،اوراپنے اندر روحِ عرب پیدا کرو،اوراس راز کوسمجھ لو کہ قوت کا سرچشمہ دین وایمان ہی ہے،جومومن کا سرمایہ ہے۔

اے صحرانشینو!جب تک تمھارے دل اسرارِ الٰہیہ کے امین ہیں،تمہیں دین کے نگہبان اور دنیا کے پاسبان ہو، تمہاری فطرت خیروشر کی میزان ہے،اورتم روئے زمین کے وارثِ ازلی ہو،جب تمہارا کوکبِ اقبال مطلعِ مشرق سے نمایاں ہوگا توہر روشنی ماند پڑ جائے گی۔

عصر خود را بنگر اے صاحب نظر
دربدن باز آفریں روح عمرؓ !
قوت از جمعیت ِدین مبیں
دین ہمہ عزم است واخلاص ویقیں
تاضمیرش راز دانِ فطرت ست
مردِ صحرا پاسبانِ فطرت ست
سادہ طبعش عیارِ زشت و خوب
از طلوعش صد ہزار انجم غروب
عصرِ حاضر زادۂ ایام تست
مستیِ او از مئے گلفام تست !
شارح اسرار اُو تو بودۂ
اولیں معمار اُو تو بودۂ!
تابہ فرزندی گرفت اور افرنگ
شاہدے گردید بے ناموس و ننگ
گر چہ شیرین ست ونوشین ست او
کج خرام وشوخ وبے دین ست او
مرد ِصحرا پختہ ترکن خام را
بر عیار خود بزن ایام را

صحرا کی فضائیں تمہارے لیے تنگ ہوسکتی ہیں ۔ لیکن اگرتم اپنی خودی کی تعمیر کرتے ہوتو تمہارے وجود کے آفاق بے کراں ہوجائیں گے،اورتم آندھی سے زیادہ تنداور سیلاب سے زیادہ بڑھ کر تیز ہوجاؤ گے اور بازی گاہِ حیات میں تمہارا کوئی مقابل نہ ہوگا۔آخرکس نے تمہیں زندگی کی دوڑ میں پیچھے کردیا ہے،حالانکہ عصر حاضر تمہاری ہی محنتوں کا پھل اورتمہاری

دعوت وجہاد کا نتیجہ ہے۔ زمانے کی باگ جس دن سے تمہارے ہاتھوں سے نکل کر مغرب کے ہاتھوں میں آئی ہے، اسی دن سے انسانیت نے اپنا وقار واعتبار، شرف وعزت اور کرامت وافتخار کھو دیا ہے، اور منافقت ودین بیزاری اس کا شعار بن گیا ہے۔

اے بادیہ نشیں! اور اے صحرانورد! اپنا مقام دیکھ اور رفتارِ زمانہ کو روک لے۔ تاریخ کا رخ موڑ دے۔ اور قافلۂ بشریت کی اس مقصد اعلیٰ اور منزل آخر کی طرف رہنمائی کر:

بگذر از دشت ودر کوہ ودمن
خیمہ را اندر وجودِ خویش زن
طبع از باد بیاباں کردہ تیز
ناقہ را سردہ بمیدان ستیز
دامنش افرنگیاں تیغے بدوش
در ہلاکِ نوعِ انسان سخت کوش
رشتۂ سود وزیاں در دستِ تست
آبروئے خاوراں در دستِ تست
اے امینِ دولتِ تہذیب ودیں
آں یدِ بیضا بر آراز آستیں

(پس چہ باید کرد)

اقبال کی فریاد روح رسول عربی سے

علامہ اقبال روحِ رسول (ﷺ) سے مخاطب ہوتے ہیں، اور امت کی زبوں حالی کا رونا روتے ہیں، اور ایمان کی حرارت اور زندگی کے شعلے کے بجھنے پر آنسو بہاتے ہیں، اور اسلامی معاشرہ میں اسلام کے اجنبی ہونے کا شکوہ کرتے ہیں، اور روح محمد (ﷺ) سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
وہ لذت آشوب نہیں بحرِ عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد
اس کوہ وبیاباں سے حدی خوان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمد
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

اقبال کو سخت تکلیف ہوتی ہے کہ عرب مغربی طاقتوں، یورپین اقوام کو اپنا دوست بنائیں، اور ان سے اپنے مسائل ومشکلات حل کرائیں، اور خاص طور سے فلسطین کے مسئلے کو ان کے حوالے کریں، اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیں کہ مغربی طاقتوں پر یہودی بری طرح مسلط ہیں، اور ان کی سیاسی، اقتصادی اور صحافتی مشنری یہود کے ہاتھ میں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو شعلۂ حیات تاریخ میں کبھی بڑی تب وتاب سے سامنے آیا تھا، وہ آج بھی عربوں کے اندر موجود ہے، اور کسی وقت بھی بھڑک سکتا ہے، مجھے امید ہے کہ عربوں کی مشکلات کا حل جنیوا اور لندن میں نہیں ہے۔

اختتامیہ

یہ چند اشعار تھے، جن کو دیوانِ اقبال سے اس موقع کے لیے منتخب کیا گیا۔ استیعاب کا نہ ارادہ تھا، اور نہ اس کا دعوی۔ بس میری خوش نصیبی ہے کہ یہ انتخاب من جانب اللہ آسان ہوا۔ اقبال عام شعرا کی طرح نہیں ہیں۔ بلکہ وہ پیغام، عقیدہ، ایمان اور حساس ضمیر رکھنے والے شاعر ہیں۔ ان کی وفات پر اگر چہ ایک عرصہ گذر چکا ہے، لیکن ان کی شاعری کل کی طرح آج بھی زندہ وتابندہ ہے۔ ☆☆☆

قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں

(شکوہ اور جواب شکوہ کی روشنی میں)

مولانا محمد علاء الدین ندوی
(استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء)

خودی سے سرشار اقبال، خوف خدا سے لرزاں ترساں اقبال، دعا و مناجات میں رطب اللسان اقبال شکوہ و شکایت، نالہ و فریاد اور قصۂ درد سنانے پر آتا ہے، تو کیا آدابِ خداوندی تک بھول جاتا ہے؟ اقبال محرم راز ہے، وہ اپنے ''دوست'' سے گستاخی اور محاذ آرائی نہیں کر سکتا، عشق و محبت سے سرشار انسان اپنے محبوب و مطلوب کے حضور میں تحکمانہ انداز میں بات نہیں کر سکتا۔ اصل یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی موجودہ پستی سے دل گرفتہ ہے، اس کا رواں رواں غمِ دوراں میں ڈوبا ہوا ہے، اس لیے خدا کے حضور اس کا لب ولہجہ جذباتی، خطیبانہ اور بے باکانہ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر انیس چشتی نے کہا: ''ان کا یہ رونا دھونا اور شکوہ و شکایت کے یہ دفتر جو کھولے گیے ہیں، ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان کی آہوں کی تڑپ، ان کا سوزِ دروں نوجوان نسل میں منتقل ہو جائے'' (۱)

جوانوں کو میری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! میری آرزو یہی ہے
میرا نور بصیرت عام کر دے

ہر چند کہ انداز شکوہ کا اختیار کیا گیا ہے، مگر امت مسلمہ کے عظیم الشان کارناموں کو اس حسن ترتیب، دلکش اور طاقتور اسلوب میں پیش کیا گیا ہے کہ مومن کی قوت عمل میں تازگی، عظمت رفتہ کو پانے کی خواہش اور ہمت و ارادے کا جوش وجذبہ امنڈ پڑا ہے۔

بال جبرئیل کی عمارت عشق، عمل اور خودی پر قائم ہے، مگر یہ بنیادی لوازم بانگ حرا ہی میں جلوہ گر ہو چکے تھے۔ یورپ کے قیام کے دوران علامہ نے مغرب کی تخریبی تہذیب کا مطالعہ بڑی عمیق نگاہوں سے کیا تھا، اس مطالعے اور اسلامی تعلیمات پر غور و فکر کے بعد ان کا یہ اذعان و یقین مزید پختہ ہو گیا کہ دنیا کی فلاح کا ذریعہ صرف اسلامی تعلیمات میں مضمر ہے، مگر صد افسوس کہ فکری اعتبار سے خود مسلمان بدحال اور عملی اعتبار سے تباہ حال ہیں۔ سوء اتفاق کہ وہی وقت عالم اسلام میں اتھل پتھل اور کرب و بے چینی کا رہا۔

یورپ کی اسلام دشمن طاقتیں عالم اسلام پر شب خون مارتی رہیں اور اپنے فکری اور عسکری حملوں سے اسے زیر کرتی چلی گئیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کی ریشہ دوانیاں نقطۂ عروج پر تھیں۔ ۱۹۰۸ء میں روس اور برطانیہ نے ایران پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا اور وہاں کے داخلی معاملات میں دخل

اندازی شروع کر دی تھی، مسلم حکومتیں بھی یورپ کی استعماریت واستبدادیت سے خوں چکاں تھیں۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی طرابلس کو اپنے مظالم کا نشانہ بنا چکا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں برطانیہ کے اشارے پر بلقانی ریاستوں نے ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ ترکی سلطنت ایک بوڑھی اور بیمار حکومت کی حیثیت سے اپنا بوجھ ڈھوئے چلی جارہی تھی اور اس کا شکوہ اور دبدبہ پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ ان حالات سے ہندوستانی مسلمان بیحد متاثر تھے اور ''جنگ بدر کی طرح نصرتِ غیبی کے خواہاں تھے، لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی شنوائی اور مدد نہیں ہورہی ہے، اس ذہنی اضطراب اور مایوسی کے نتیجے میں مسلمان اپنے حالات درست کرنے کے بجائے خدا پر نکتہ چینی کرنے لگے۔'' (۲)

مایوسی اور بے عملی کی اس فضا میں علامہ اقبال انگلستان سے واپس آئے تو نئی سوچ اور شاعری کے نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ آئے۔ دل گرفتہ تو تھے ہی، مگر وہ خدا شناس اور ملہم شاعر تھے، اپنی دل گرفتگی اور اپنے تاثر کو شکوہ کی شکل دی، جسے انہوں نے اپریل ۱۹۱۱ء میں حمایت الاسلام کے جلسے میں سنایا۔ موضوع کے لحاظ سے اس نظم کا نام شکوہ رکھا گیا، کیونکہ یہ ایک فریاد ہے جسے بارگاہ الٰہی میں پیش کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ہم تیرے اور تیرے نبی کے نام لیوا ہیں، مگر تیری نوازشات اور انعامات کے مستحق غیر مسلم ہیں اور ہمارے نصیبے میں ذلت وخواری آئی ہے؟ دراصل اقبال نے عام مسلمانوں کے لاشعوری احساسات کی ترجمانی کی ہے۔

سلیم احمد کہتے ہیں: ''ایک طرف ان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے محبوب کی سب سے چہیتی امت ہیں اور دوسری طرف یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان کا مکمل زوال ہو چکا ہے۔ عقیدے اور حقیقت کے اس ٹکراؤ سے مسلمانوں کا وہ مخصوص المیہ پیدا ہوتا ہے جو ''شکوہ'' کا موضوع ہے'' (۳)۔

شکوہ میں مسلمانوں کی پستی کا گلہ ہے تو جواب شکوہ میں اس سے ابھرنے کی ترکیب بتائی گئی ہے۔ پستی و بے وقعتی کا گلہ کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ یہ نظم افسردگی اور پژمردگی پیدا نہیں کرتی، بلکہ الٹے مسلمانوں کے عظیم الشان کارناموں کا فخریہ تذکرہ حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ نظم میں قوتِ عمل، تازگی، جوش وہمت کی شان بہت نمایاں ہے۔ شاعر کا مفکرانہ اور فنکارانہ کمال ہے کہ ناخوشگوار حالات اور ذلت وپستی کے ماحول میں عظمتِ رفتہ کا بیان قاری کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کہتے ہیں: ''شکوہ اردو ادب میں ایک انوکھی چیز ہے۔ ندرتِ تخیل کے علاوہ حقیقت نگاری اور شاعرانہ مصوری کی شان بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس نظم میں اقبال نے لفظوں کے ذریعے سے مسلمانوں کی تاریخ کی تصویر کھینچی ہے اور تخیل کے موئے قلم سے ایسی رنگ آمیزی کی ہے کہ حقیقت مجسم سامنے آجاتی ہے، شکوہ کی زبان اس قدر دلکش اور اشعار کی سلاست اور روانی کا یہ عالم ہے کہ پڑھنے والے پر محویت کا عالم طاری ہوجاتا ہے'' (۴)۔

شکوہ اور جواب شکوہ دو یگانہ طنزیہ نظمیں ہیں۔ یہ ایک قد آدم آئینہ ہے، جو مسلمانوں کو ان کا صحیح چہرہ دکھاتا ہے۔ طنز کے پردے میں تعلیم، تلقین، اصلاح اور ہمدردی کارفرما ہے۔ اصل یہ ہے کہ طنز کی گہری چوٹ انسان کے اندر تبدیلی کے احساس کو دوچند کر دیتی ہے۔ شکوہ میں شکایات کا دفتر کھول کر زوالِ مسلم کو آشکارا کیا گیا ہے اور جوابِ شکوہ میں عزت وسرخروئی کے راز سے پردہ ہٹایا گیا ہے۔ محمد بدیع الزماں

کہتے ہیں:

''اقبال کی سب سے طویل طنزیہ نظم شکوہ ہے۔ اس میں جس شاعرانہ انداز میں مسلمانوں کی پستی کا گلہ خدا سے کیا گیا ہے اور جوابِ شکوہ میں ابھرنے کی جو ترتیب بتائی گئی ہے اس میں الہامِ ربانی کی شان نظر آتی ہے۔ اس طنز کے ذریعے اقبال نے خدا اور انسان کے رشتے کو استوار کیا ہے۔ اس میں انہوں نے خدا سے شوخی کی ہے'' (۵)۔

گوناگوں ضمنی لہجے، فکر و خیال کی ترتیب اور مضامین کے تنوع کے لحاظ سے جس میں کہیں عجز و نیازمندی ہے۔ کہیں غیرت و انانیت کا احساس ہے۔ کہیں تندی و تلخی ہے۔ کہیں ناز اور شوخی ہے۔ کہیں تأسف اور افسردگی کا لہجہ ہے۔ کہیں گریہ و زاری اور کہیں دعائیہ انداز ہے۔ شکوے کو ہم نے چند حصوں میں تقسیم کیا ہے؛

تمہیدی حصہ: یہ دو بندوں پر مشتمل ہے، اقبال کے خیال میں مسلمان اب زوال و انحطاط کی اس منزل کو پہنچ چکے ہیں کہ اس کے بعد اب مزید ان کی بربادی کا تماشا نہیں دیکھا جا سکتا۔ اب قصۂ درد سنائے اور نالہ و فریاد کیے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ جب خدا نے مجھے قوتِ گویائی عطا فرمائی ہے تو پھر کیوں نہ ''دوست'' کو اپنی روداد غم سناؤں۔ چنانچہ شاعر نے خدا سے التجا کی کہ اے خدا! حمد و ثنا کے خوگر بندوں سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے کہ اب ہمارے اندر اپنے درد و کسک کو ضبط کرنے کا یارا نہیں رہا۔

جرأت آموز میری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو (بند:۱)

اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے (بند:۲)

شکوہ کا دوسرا حصہ: یہ گیارہ بندوں پر مشتمل ہے، جس کا آغاز اس طرح ہوا ہے ؎

تھی تو موجود ازل ہی سے تیری ذات قدیم
پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم (بند:۳)

اس پورے حصے میں شکوہ نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ امت مسلمہ کے عظیم الشان کارناموں کا تذکرہ ہے کہ ہم مسلمانوں نے دنیا کو تیرے نام اور صفات سے آگاہ کیا۔ ہم نے توحید کا علم بلند کیا۔ دنیا پیکر محسوس کی پرستش کی عادی تھی۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر ہم نے تیرے نام کا آوازہ بلند کیا اور تیرے پیغام کو عام کیا۔ ہم نے تیری عظمتوں کی خاطر دنیا والوں سے دشمنی اور لڑائی مول لی۔ کبھی ہم یورپ سے برسرپیکار رہے۔ کبھی ہم نے خشکیوں اور سمندروں میں تیری عظمت کا ڈنکا بجایا۔ بت شکنی ہمارا طرۂ امتیاز رہا۔ تاہم بت فروشی سے کبھی ہم نے اپنا رشتہ ناطہ نہیں جوڑا۔ ہمارے علاوہ اور کون ہے جس نے تجھ سے محبت کی اور تیرے رسول اکرم (ﷺ) کی عزت و ناموس کے لیے اپنا خون بہایا۔ یہاں اقبال مسلمان قوم کا ترجمان بن کر شد و مد اور فخر کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مسلمانوں نے دنیا کی جاہل امتوں اور بیمار قوموں کے سامنے وہ نسخۂ شفا پیش کیا جو توحید میں مضمر ہے ؎

تجھ کو معلوم ہے، لیتا تھا کوئی نام تیرا
قوت بازوئے مسلم نے کیا کام تیرا (بند:۴)

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی
اہل چیں، چین میں ایران میں ساسانی بھی (بند:۵)

اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی
اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

پر تیرے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے؟
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے (بند:۸)
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے (بند:۱۲)
صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے (بند:۱۳)
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

تیسرا حصہ: امت مسلمہ کے درخشاں ماضی کی عظیم و حسین جھلکیاں دکھانے کے بعد اب تیسرے حصے میں نظم کا رخ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کی طرف مڑ جاتا ہے۔ یہ پورا حصہ شکایتوں پر مبنی ہے۔ اقبال شکوہ کرتے ہیں کہ دنیا میں ہر جگہ مسلمان غیر مسلموں کے مقابلے میں، حقیر و ذلیل اور بے آبرو ہیں۔ ہر چہار جانب وہ جبر و استبداد کا نشانہ بنائے جا رہے ہیں۔ ان کی یہ حالت زار دیکھ کر دوسری قومیں تک خندہ زن ہیں، کفار تیر و نشتر چلا رہے ہیں، اسلام کی ہنسی اڑائی جا رہی ہے۔ غیروں کے طعنے سننے پڑ رہے ہیں۔ ہر چہار سو وہ رُسوا ہو رہے ہیں۔ ناداری ان کی قسمت بن گئی ہے۔ وہ خیالی دنیا میں جیتے ہیں، کیا یہی مسلمان ہونے کا صلہ ہے؟!

اے خدا! کیا تجھے توحید کی بقا کا خیال نہیں؟ ہم تو توحید پر قائم رہ کر تیرے نام کو جاوداں رکھنا چاہتے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ جام کے بغیر ساقی رہ جائے، آج بھی ہم تیرے رسول (ﷺ) کے دامن سے وابستہ ہیں۔ تکبیر کی چنگاری سے آج بھی ہمارے سینے دہک رہے ہیں۔ بلالی زندگی سے ہمارا رشتہ قائم ہے۔ مصائب برداشت کرنا ہمارا شیوہ ہے۔ دین بھی وہی ہے، امت بھی وہی ہے، مگر کیا بات ہے کہ ہم پہلی جیسی نوازشات اور الطاف کریمانہ سے محروم ہیں۔ ان شکایتوں کو اقبال کے بلیغ اشعار میں دیکھئے ۔

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر (بند:۱۴)
اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں (بند:۱۶)
طعن اغیار ہے رسوائی ہے ناداری ہے
کیا تیرے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے (بند:۱۷)
دردلیلی بھی وہی، قیس کا پہلو بھی وہی
نجد کے دشت و جبل میں رم آہو بھی وہی (بند:۲۰)
عشق کا دل بھی وہی، حسن کا جادو بھی وہی
امت احمد مرسل بھی وہی تو بھی وہی
پھر یہ آزردگی غیر سبب کیا معنی
اپنے شیداؤں پہ یہ چشم غضب کیا معنی
آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثل بلال حبشی رکھتے ہیں (بند:۲۱)

آگے چل کر محبوبِ حقیقی کے سامنے عاشق شاعر کی شوخی میں ذرا تلخی آجاتی ہے۔ وہ کچھ زیادہ ہی بے باکی اور تیکھی زبان میں کہتا ہے ''مانا کہ ہم عشق و محبت میں اسلاف کا مقابلہ نہیں کر سکتے، تسلیم و رضا میں ان کا رنگ نہیں جما سکتے، لیکن

گستاخی معاف ہو، آپ نے بھی تو اپنے سچے عاشقوں کو فراموش کر دیا ہے اور غیروں سے راہ و رسم اور آشنائی و شناسائی پیدا کر لی ہے۔

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہر جائی ہے (بند:۲۲)

لہجے اور مزاج کے اعتبار سے یہ قصۂ درد کا کلائمکس ہے، اس کے بعد گتھیاں سلجھتی چلی جاتی ہیں، جرأت آموز شاعر کی تلخی میں کمی آتی ہے، شاعر عنایات ربانی اور صاحب الطاف عمیم کی فیض بخشیوں کو یاد دلا کر سوال کرتا ہے، کہ آخر کوہ فاراں میں طلوع ہونے والے آفتاب سے ہم نے بھی روشنی پائی ہے، تو پھر ہمارے اندر کے ایمان کی چنگاری کیوں شعلۂ جوالہ نہیں بنتی ؟!

آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں (بند:۲۳)

شاعر اور نرم پڑتا ہے، وہ دھیمی لے اور شفقت آمیز اسلوب اختیار کر کے فیضان سماوی سے محرومی کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ دعا کے لیے زبان کھول دیتا ہے۔ خدا کی نگاہ کرم کا سوالی بنتا ہے۔ یہاں شاعر پہ پوری طرح سے متانت اور سنجیدگی چھا جاتی ہے، وہ راز و نیاز کرنے لگتا ہے، اور عاجزی و فروتنی کے ساتھ اپنی شکایت کے جواز کو تفہیم کے انداز میں پیش کرتا ہے۔

اپنے پروانوں کو پھر ذوق خود افروزی دے
برق دیرینہ کو فرمان جگر سوزی دے (بند:۲۵)

اے خدا! تیرے بندے اپنی غلطیوں پہ نادم ہیں اور تیری نوازشوں کے منتظر ہیں، انہیں آتش عشق میں جلنے کی طاقت دے، وہ تو تیری راہ میں شہادت کا لہو بہانے کے لیے اور تیرے دین کو دنیا میں غالب کرنے کے لیے تیار ہیں۔

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز
لے اڑا بلبل بے پر کو مذاق پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے (بند:۲۶)
مشکلیں امت مرحوم کی آسان کر دے
مور بے مایہ کو ہم دوش سلیماں کر دے
جنس نایاب محبت کو پھر ارزاں کر دے
ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے (بند:۲۷)

یہاں اقبال کا روئے سخن خاص طور پر ہندی مسلمانوں کی طرف ہے، یوں تو مسلمان دنیا کے گوشے گوشے میں بدحالی، مایوسی اور ابتری کے شکار اور اعداء اسلام کے نشانے پر ہیں، مگر برصغیر میں تو ان کی زبوں حالی، اور انتشار و پراگندگی نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہے، اس لیے شکوہ اور جواب شکوہ دراصل برصغیر کے مسلمانوں کے درد والم کی ترجمانی ہے۔

یہ بہت ہی بلیغ شعر ہے، ہندوستان میں ہزاروں سال سے مسلمان رہتے آئے ہیں اور یہاں کی ثقافت اور فلسفے سے متاثر ہو گئے ہیں، ''دیر نشیں'' کی تعبیر اختیار کر کے ان کو بت پرست ثابت کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ ان کو تجدید ایمان کی دعوت دینا ہے، اقبال نے اپنا یہ خیال جگہ جگہ ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان کے سارے مسلمان اگر حقیقی معنوں میں مسلمان بن جائیں تو ساری دنیا کو فتح کر سکتے ہیں۔ شاعر کی یہ دلی تمنا دعا

کی شکل میں ڈھل جاتی ہے، فرماتے ہیں ۔

مشکلیں امت مرحوم کی آساں کردے
مور بے مایہ کو ہمدوش سلیماں کردے (بند:۲۷)

اس حصے میں شکوہ و شکایت اور نالہ و فریاد ختم ہو جاتا ہے۔ باقی کے تین بندوں میں اپنی قوم کی پستی اور زوال کو دیکھ کر شاعر اپنی طبیعت کے الجھاؤ، جذبات کی رستاخیزی، قوم کی ناراضگی، اور بے اعتنائی کا نقشہ پیش کرتا ہے اور حزن و یاس اور درد و الم کے ساتھ پکار اٹھتا ہے ۔

لطف مرنے میں ہے باقی، نہ مزا جینے میں
کچھ مزا ہے تو یہی خون جگر پینے میں (بند:۳۰)

غلبۂ یاس و حرمان کے باوجود شاعر دین برحق کی جو خدمت کر سکتا تھا اس سے دریغ نہیں کرتا، ''کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی''۔ آخر میں شاعر اس حقیقت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتا کہ اگر چہ میں عجمی طریقے پر شعر کہتا ہوں ۔ ایرانی روایات کا پابند ہوں۔ ہندی الاصل ہوں لیکن اسلامی روح سے آشنا ہوں۔ اگر میرے کلام کا غائر مطالعہ کیا جائے تو اسلامی حقائق و معانی جھلملاتے نظر آئیں گے، شکوہ کا یہ حصہ اس بلیغ، معنی خیز اور اظہار تعلّی پر ختم ہوتا ہے ۔

عجمی خُم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری (بند:۳۱)

جواب شکوہ

شکوہ جیسی یگانہ نظم کے منظر عام پہ آنے کے ڈیڑھ دو سال بعد اقبال نے جواب شکوہ لکھی اور اسے بھی حمایت الاسلام کے جلسے ۱۹۱۳ء میں پیش کی۔ ایک ایک شعر نیلام کیا گیا اور اس سے جو گراں قدر رقم جمع ہوئی وہ بلقان فنڈ کے سپرد کر دی گئی۔ شکوہ میں شکایت کی جرأت دراصل اس ناز و انداز اور محبت و وارفتگی کا شاخسانہ تھی جس سے شاعر کا دل معمور اور جس کی غیرت دینی احساس زیاں کے درد سے بے چین تھی، چنانچہ وہ فخریہ کہتا ہے ۔

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا، نالۂ بے باک مرا (بند:۱)

شکوہ میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا اظہار تھا، دل شکستگی کی ایک کیفیت تھی، جواب شکوہ میں اس دل شکستگی اور کیفیت کی توجیہ ہے، عمل جراحی ہے، جس کا مقصد اصلاح ہے، جستجوئے آرزو ہے، ''لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو'' ۔ محمد بدیع الزماں کہتے ہیں:

''یہ نظم ایک بڑے ذہن کا درد و داغ اور جستجوئے آرزو ہے۔ اس میں سینکڑوں اچٹتی ضربیں اور ہزاروں کھلے نشتر ہیں، جو ردعمل ہیں ملت اسلامیہ کی انتہائی پستی اور دین سے بے رغبتی کا۔ اس میں لطافت اور تلخی کے عناصر ہی صرف شامل نہیں ہیں، بلکہ اس میں ایک خوش آئند مستقبل کا پیغام بھی ملتا ہے۔ اس میں کہیں خطیبانہ ہیجان و طغیانی ہے، تو کہیں ہلکی ناراضگی کا اظہار، مگر ہمدردی کا جذبہ ساری نظم میں یکساں ہے۔

اقبال نے اس نظم میں ایک ہوش مند فلسفی اور باکمال شاعر کی طرح اپنی نصیحتوں کو دلائل اور نشیب و فراز کے اصولوں سے پرتاثیر بنا کر غیبی آواز میں عام مسلمانوں کو بیدار کرنے اور راہ عمل پہ گامزن کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے نشتروں سے دکھتی رگوں کو درست کرنے میں انہوں نے بڑے حسن سے کام لیا، لوگوں کو متوجہ پا کر پیغمبرانہ انداز میں گفتگو کی اور دوٹوک باتیں کہیں اور اس طرح مسلمانوں کے ذہنی اور عملی تعطل اور ان

کے غیر اسلامی عقائد و شعائر کی بنیادوں کو ہلا ڈالا'' (۶)

وہ عشق جو جرأت آموز اور نالۂ بے باک کا محرک بنا تھا، وہی عشق اور نالۂ بے باک آسماں چیر کر عرش کی بلندیوں تک جا پہنچا، تو وہاں کے باسیوں میں اس گستاخانہ شکوے سے کھلبلی مچ گئی اور قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں؛ فرشتے، سیارے، ستارے، چاند، کہکشاں سب حیرت زدہ تھے کہ یہ کون ہے، مگر معلوم نہ کر سکے، ہاں رضوان سمجھ گیا کہ یہ وہی مسجودِ ملائک انسان ہے جو جنت سے نکالا گیا تھا۔

پیرِ گردوں نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی
بولے سیارے سرِ عرشِ بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا نہیں اہلِ زمیں ہے کوئی
کہکشاں کہتی تھی پوشیدہ یہیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا مِرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھ کو جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

فرشتوں نے خاک کی چٹکی سے بنے اس انسان پہ تأسف کا بھی اظہار کیا کہ یہ احمق، نادان اور شوخ و گستاخ انسان جو منطق و فلسفہ میں تو بڑا طاق ہے، مگر عجز کے اسرار اور آدابِ بندگی سے ایسا کورا کہ اسے بات تک کرنے کا سلیقہ نہیں۔

ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو (بند:۴)

یہاں شاعر بتاتا ہے کہ خدا کے بندوں کا ترجمان بن کر اس نے اپنی شیریں سخنی اور عشق و محبت کے البیلے انداز میں جو دردانگیز افسانہ بیان کیا تھا اسے بارگاہِ خداوندی میں قبول کر لیا گیا، بلکہ خدا نے خود اس کے حسنِ ادا کو جس کا اظہار اربابِ وفا اور حمد کے خوگر انسانوں نے دو بندوں میں کیا تھا کے جواب میں فرمایا۔

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا
اشک بےتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا
کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا
شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے (بند:۵)

خدائے ذوالجلال والجمال کی اس مقبول غیبی آواز سے عالمِ بالا میں ایک سناٹا چھا جاتا ہے۔ وہ شاعر جسے شکایت تھی کہ مسلمانوں کی بدحالی و زبوں حالی کی وجہ سے انہیں الطافِ کریمانہ سے محروم رکھا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و شفقت بھرے انداز میں اپنی ازلی فیض رسانیوں کا جواب یوں مرحمت فرماتا ہے۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہرِ قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں (بند:۶)

شانِ کئی سے مراد شاہانہ شوکت اور بادشاہت کی قابلیت ہے۔ کَے ایران کے بادشاہوں کا لقب ہوا کرتا تھا، کیقباد، کیخسرو وغیرہ۔

شکوے کے تیسرے بند سے ۱۳ویں بند تک شاعر نے مسلمانوں کے قابلِ فخر کارناموں کی داستان سنائی تھی، پھر پہلو بدل کر ۱۴ویں بند سے لے کر ۲۰ویں بند تک انہی مسلمانوں

کی زبوں حالی کا رونا رویا تھا، جواب شکوہ میں اس کے حقیقی اسباب کو بے نقاب کیا جا رہا ہے، یعنی دین سے ان کی بے اعتنائی، ان کی صفوں کی پراگندگی، الحاد، کفر اور لادینی تحریکوں کا ان کے درمیان پروان چڑھنا اور مذہب کی حقیقی روح کا ختم ہو جانا۔ یہاں شکوہ کے ایک ایک دعوی کی تردید کی جا رہی ہے ۔تردید کا انداز طنزیہ ہے، اظہار حقیقت میں ذرا تلخی وتندی آ گئی ہے۔ ملاحظہ ہو بند ۷ تا ۱۷۔ ان بندوں کا خلاصہ کچھ یوں ہے؛

تمہاری موجودہ ناگفتہ بہ حالت کی اصل وجہ یہ ہے کہ تم تعلیمات رسول (ﷺ) سے برگشتہ ہو گئے ہو۔ مسلمان کبھی بت شکن تھا، تم بت پرست بن گئے ہو، کبھی وہ اللہ کا عاشق وسودائی تھا، تم ہمیں ہرجائی ہونے کا طعنہ دیتے ہو، اگر تمہاری نگاہ میں ہم ہرجائی ٹھہرے تو تم کسی ''یکجائی'' کو خدا کیوں نہیں بنا لیتے، نالۂ نیم شبی اور سحر خیزی سے تمہیں واسطہ نہیں، البتہ خواب شیریں اور دوستوں کے ساتھ خرمستی تمہیں بہت عزیز ہے، تم نہ کسی فن سے آشنا، نہ علم وہنر سے واقف، نہ تحقیق وجستجو کا ذوق، ہاں کفن بیچ کھانا تمہارا شیوہ اور قبر فروشی تمہارا پیشہ ۔

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو
بجلیاں جن پہ ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے (بند:۱۰)

تمہیں بڑا ناز ہے اپنے کارنامے گنوانے کا، مگر ان کارناموں کے انجام دینے والے تم نہیں، وہ تو تمہارے اسلاف تھے، تمہاری گستاخانہ جرأت کا تو حال یہ ہے کہ تم خدا کی صفت عدل پر اعتراض کر بیٹھے ہو اور گستاخانہ زبان میں تم نے کہا۔

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملے حور وقصور
اور بے چارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور (شکوہ بند:۱۶)

لیکن سچی بات یہ ہے کہ ۔

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسی ہی نہیں (بند۱۲)

فرقہ بندی، مصلحت پسندی، اپنے اسلاف کے طریقوں سے بیزاری تمہارا وطیرہ، مساجد غربا کے دم سے قائم، رہے اہل دولت تو وہ نشۂ دولت میں مدہوش، رسم اذاں رہ گئی ہے، مگر روح بلالی مفقود، وضع قطع میں تم نصاری اور تہذیب و تمدن میں ہندوؤں سے لگا کھانے والے ۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں (بند:۱۳)
قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محبت کا تمہیں پاس نہیں (بند:۱۴)
امرائے دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے (بند:۱۵)
واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برق طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے (بند:۱۶)

جو ب شکوہ میں اس وقت اور زیادہ کڑواہٹ آ جاتی

ہے، جب یہ شور مچتا ہے کہ دنیا میں مسلمان مٹتے جا رہے ہیں ۔

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاری تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو (بند:۱۷)

آخر وہ کیسے مسلمان تھے جو جاں نثاری کے لیے تیار رہتے تھے۔ تمہیں موت کا خوف کھائے جاتا ہے۔ وہ خدا سے لرزاں ترساں رہتے تھے، نہ تو تمہارے اندر فقر حیدری، نہ ہی دولت عثمانی، کیا یہ صحیح نہیں کہ بیٹا نالائق ہو تو باپ کی جائیداد سے عاق کر دیا جاتا ہے۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابل میراث پدر کیوں کر ہو (بند:۱۹)

مسلمانوں کی موجودہ ذلت وخواری کے اسباب کے ضمن میں اقبال نے بڑا کلیدی نکتہ پیش کیا ہے جو قابل توجہ ہے۔ تاہم ذیل کے اسباب کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے ۔

حیدری فقر ہے، نے دولت عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے (بند:۲۰)
وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر (بند:۲۰)
تم آپس میں غضبناک وہ آپس میں رحیم
تم خطا کار و خطا بیں وہ خطا پوش و کریم (بند:۲۱)
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم (بند:۲۱)

خود کشی شیوہ تمہارا وہ غیور و خوددار
تم اخوت سے گریزاں وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو وہ گلستاں بہ کنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت ان کی (بند:۲۲)

ہم نے تمہیں سرداری دی، تم نے اسلاف کے طریقے کو چھوڑ کر کفر کی راہ پسند کی۔ تم شریعت کے ہر بند سے آزاد ہوئے۔ مسجدوں کو آباد رکھنے کے علاوہ تم نے ہر جہاں کو آباد کیا۔ تمہارے نوجوانوں کے سینے عشق رسول سے خالی ہیں اور تمہاری لڑکیاں بے پردگی کی عادی ہیں۔ وہ برملا کہتی ہیں عاشق آزاد پھر حجاب رخ لیلی کی پابندی کیسی، تم مادیت کی آگ میں جل کر فنا ہو رہے ہو، کاش کہ تم ایمان کی آگ میں جلتے اور محبت کی تب و تاب پیدا کرتے تو یہی آگ تمہارے لیے گلزار ابراہیم بن جاتی ۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا (بند:۲۵)

یہاں پہنچ کر شکوہ سنج شاعر کی شوخی و تلخی کا رنگ ہمدردانہ غور و فکر اور لطافت و نرمی کے رنگ میں تبدیل ہوتا نظر آتا ہے اور امید و بیم کا مژدہ سناتا ہے، کہا جاتا ہے؛ موجودہ زبوں حالی سے مایوسی اور افسردگی کی ضرورت نہیں، خون شہدا کی سرخی پھول برسا رہی ہے، مصائب کے بادل چھٹتے نظر آتے ہیں، فیروزمندی کی نئی صبح طلوع ہونے والی ہے ۔

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی

خس وخاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
گل برانداز ہے خون شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے (بند:۲۶)

آخری حصہ: یہاں سے نظم کا آخری حصہ شروع ہوتا ہے، اگر چہ عالم اسلام اس وقت پریشان کن حالات کے گرداب میں ہے، بلقان نے ترکی پر حملہ کر دیا ہے، بلغاریہ میں شورش برپا ہے، تاہم گھبرانے کی ضرورت نہیں، مظالم کا یہ عارضی دور ختم ہوگا، مظلوموں کا خون کبھی رائیگاں نہیں جائے گا۔ اسلام کبھی مٹ نہیں سکتا، یہ ممکن نہیں ہے کہ مسلمان تو فنا ہو جائیں، لیکن اسلام باقی رہ جائے، اسلام تو مسلمانوں ہی کے دم سے ہے، بس قدرت تیرے ایثار، حوصلہ، صبر اور استقامت کا امتحان لے رہی ہے ۔

کیوں ہراساں ہے صہیل فرس اعدا سے
نور حق مٹ نہ سکے گا نفس اعدا سے (بند:۳۰)

شاعر حوصلہ دیتے ہوئے کہتا ہے، توحید کی چمن بندی صدیوں سال کی جدو جہد کا نتیجہ ہے، یہ باد مخالف کے طوفانی بگولوں سے ویراں ہو کر مٹ نہیں سکتا، اے مسلماں! تو میدان عمل میں آ اور اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو ۔

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے (بند:۳۱)

بس شرط اولیں یہ ہے کہ عشق رسول میں فنا ہو جاؤ، تمہاری ہر کمزوری طاقت میں بدل جائے گی ۔

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے (بند:۳۲)

یاد رکھو اگر تم نے اپنی زندگی سے اسم محمد کو نکال دیا تو تم بھی گم کردہ راہ ہو جاؤ گے اور تمہاری دنیا بھی تیرہ وتار ہو جائے گی۔ تمہاری قسمت اور دنیا کی رونق آپ (ﷺ) سے ہے، آپ نہ ہوں تو کوئی توحید کا نام لینے والا نہ ہو، نہ دین اسلام کا غلغلہ ہو، نہ تمہاری کوئی شان باقی رہے، اسلام کے جسم کی نبض میں حرکت اور قلب میں نور آپ کی وجہ سے ہے ۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
نہ یہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزم توحید جو دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

جو ب شکوہ کا اختتام خدا کے اس جواب سے ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ہم نے دو نعمتیں دی ہیں: ایک عشق کی تلوار (طاقت) اور دوم عقل کی سپر (دولت)، لہذا تو عشق کی تلوار چلا اور عقل کو ڈھال بنا کر میری مرضی پہ جاں نثار ہو جا، میں تیری آرزو پوری کروں گا ۔

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری
مرد درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں (آخری بند)

محمد بدیع الزماں کہتے ہیں:

"اس دنیاوی چمن بندی میں ایسے بلبل کا ہونا ضروری ہی نہیں بقائے عالم کے لیے ناگزیر ہے، جو نامساعد حالات میں توحید کے نغمے گا گا کر لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش

میں مصروف ہو'' (۷)۔

نعت ہی کے ضمن میں اقبال جواب شکوہ کے آخری حصے میں وضاحت کرتے ہیں کہ جہاں میں اسم محمد کا اجالا دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل چکا ہے، یہ نتیجہ ہے عشق رسول کا اور اسی عشق رسول کی بدولت غیبی نصرت آکر رہے گی، یہ ایک اٹل کلیہ ہے، کہ عشق رسول اختیار کرو اور دنیا میں سرخروئی سے ہم کنار ہو جاؤ۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

''پیغام'' اور نظم کا اختتام ایک ساتھ ہوتا ہے۔ شکوے اور اس کے تمام جوابات ذہن سے محو ہو جاتے ہیں اور صرف آخری شعر زبان پر رہتا ہے اور دل و دماغ پر مضراہیں لگاتا رہتا ہے، شکوہ کرنے والا مطمئن ہی نہیں ہو جاتا، محو حیرت ہو جاتا ہے کہ صرف دنیا کی سرخروئی کا مطالبہ کیا تھا اور جواب میں لوح و قلم تک حوالے کرنے کی بات کہہ دی گئی، سناٹا چھا جاتا ہے، شاکی پشیمان ہو جاتا ہے، لیکن یہی آخری شعر اس کو پست ہمت ہونے سے بچا بھی لیتا ہے اور نیا حوصلہ اور ولولہ عطا کرتا ہے، یہی اقبال کا مقصد و منشا اور دونوں نظموں کو ایک لڑی میں پرونے کا کمال تھا'' (۸)

حواشی

(۱) اقبال کا ادبی اور تہذیبی ورثہ ص ۵۳ انیس چشتی، ایجوکیشنل پبلشنگ، دہلی

(۲) اقبال فکر و فن ص ۹۸ ڈاکٹر سید محمد ہاشم، شعبۂ اردو علی گڑھ

(۳) انٹرنیٹ ''شکوہ''

(۴) شرح بانگ درا ص ۴۹۳ اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی

(۵) صہبائے مسلمانی ص ۶۰ محمد بدیع الزماں، دانش بکڈپو، ٹانڈہ

(۶) کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں ص ۲۰-۲۱، محمد بدیع الزماں، دانش بکڈپو، ٹانڈہ

(۷) اقبال فکر و فن ص ۱۳۴

(۸) ایضاً ص ۱۳۴

مولانا الطاف حسین حالی کی شاعری میں اجتماعی عوامل

ڈاکٹر محمد سمیع اختر
(ایسوسی ایٹ پروفیسر) شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تاریخِ انسانی کے ہر دور میں شعرا کا ایک ایسا طبقہ موجود رہا ہے جس نے شاعری کو محض لہو ولعب، ممدوح کی جھوٹی تعریف وتوصیف، امرا کی تملق وخوشامد پسندی، خیالی محبوب کے محاسن ومفاتن کی وصف نگاری جیسے تفریحی موضوعات میں اپنی فطری صلاحیتوں کو ضائع کرنے کے بجائے اس کے ذریعے انسانی اور اخلاقی بنیادوں پر قوم کی اصلاح وتربیت کی کوشش کی۔ مولانا حالی کا شمار ایسے ہی تعمیر پسند شعرا میں سرِ فہرست ہوتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی(۱) (۱۸۳۷-۱۹۱۴ء) متعدد الجہات اور تاریخ ساز حیثیت کے حامل انسان تھے۔ وہ ایک عظیم مصلح اور بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ طرز انشا پرداز، ممتاز ناقد اور نامور صحافی بھی تھے۔ انھوں نے تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کے میدان میں اپنی گراں قدر تالیفات کی بدولت ایک منفرد مقام پیدا کرلیا تھا۔ عربی و فارسی زبانوں میں مہارت اور انگریزی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت کی بدولت انھوں نے اردو زبان میں شاعری، تنقید نگاری اور سوانح نویسی کو ایک علمی وتحقیقی رنگ عطا کیا۔ ان کی شخصیت میں دیگر تمام خصوصیات کے مقابل شاعری کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔ انھوں نے اس گراں قدر فطری صلاحیت کے ذریعے حتی المقدور قوم کی اصلاح وتربیت کا کام لیا اور انھوں نے اردو شاعری کو تخیلات وتصورات کی سحر انگیز وادیوں سے نکال کر اس کا رشتہ عوام اور عوامی مسائل سے جوڑ دیا۔

مولانا حالی کی نشو ونما اور تعلیم وتربیت خالص دینی ماحول میں ہوئی تھی۔ انھوں نے زندگی کے ابتدائی مراحل میں قرآنِ کریم کا حفظ مکمل کرنے کے ساتھ تفسیر، حدیث وفقہ جیسے اسلامی علوم سے متعلق اہم کتابوں کا بھی ذاتی طور پر بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ پانی پت میں گذرا جہاں وہ پرسکون ماحول میں خاموشی کے ساتھ علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف رہے۔ لیکن گرد وپیش کے حالات اور معاشرے میں رونما ہونے والی اجتماعی، سماجی اور سیاسی تبدیلیوں سے بھی پوری طرح واقف رہے۔ مولانا حالی شروع سے ہی ایک حساس طبیعت، بیدار ضمیر، دردمند دل اور تعمیری فکر کے حامل انسان تھے، گوکہ انھوں نے ۱۸۵۷ء سے قبل حصولِ تعلیم کی غرض سے دہلی میں اپنے مختصر قیام کے دوران اردو کی غزلیہ شاعری میں بھی طبع آزمائی کی اور اپنی ذہانت اور شاعری کی فطری صلاحیت کی بدولت اس دور کے غالب، داغ، مومن

اور شیفتہ جیسے کہنہ مشق بعض بزرگ شعرا کو اپنے کلام سے متاثر کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اردو شاعری کا دائرہ غزل گوئی تک محدود تھا۔ ان بزرگ شعرا کی رفاقت اور سرپرستی نے ان کے فطری ذوق کو جلا بخشی اور ان کی شاعری میں خود اعتمادی پیدا کی۔ انھوں نے اپنے بزرگ شعرا سے استفادہ تو ضرور کیا لیکن ان کی تقلید کو کبھی اپنے لیے باعثِ افتخار نہیں سمجھا اور اپنی انفرادیت کو ہمیشہ باقی رکھا، یہاں تک کہ غزل گوئی کے میدان میں بھی اپنی ایک الگ پہچان بنائی، گو کہ اس بے مقصد اور لہو و لعب پر مبنی عشقیہ شاعری کا سلسلہ زیادہ دراز نہیں رہا اور کچھ ہی دنوں کے بعد انگریزوں کے خلاف آخری مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے خلاف دہلی اور اس کے اطراف میں عمومی بغاوت کا سلسلہ شروع ہوگیا اور حالی تین چار سالوں تک پانی پت کے اپنے مکان میں قید سے ہو کر رہ گئے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور اس کی ناکامی کے بعد دہلی اور اس کے اطراف میں مسلمانوں کے خلاف انگریز حکمراں کی ظلم و زیادتی اور انتقام پر مبنی انسانیت سوز وحشیانہ کاروائیوں کا انھوں نے بذاتِ خود مشاہدہ کیا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انگریز حکمراں مسلمانوں کو اس بغاوت کا پوری طرح ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اس عمومی بغاوت کے نتیجے میں پوری مسلم قوم پر آنے والی چوطرفہ ہلاکت و بربادی، لاچاری و بے بسی، یاس و ناامیدی، ادبار و پستی اور غربت و محتاجی کے دردناک مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ اپنی ناعاقبت اندیشی اور حکمت و بصیرت سے محروم قیادت کی بدولت کس طرح چشم زدن میں کسی حد تک ایک با اقتدار، معزز، خوش حال، متمدن اور مہذب قوم، محکوم، نادار، ناخواندہ، بے وقعت اور پسماندہ قوموں کی صف میں کھڑی ہوگئی۔ اس جانکاہ سانحے سے مولانا حالی خون کے آنسو رونے پر مجبور ہوئے اور اس نے ان کی فکر اور ان کی شاعری دونوں کا رخ تبدیل کر دیا اور انھوں نے اردو شاعری کی تجدید و تطہیر کرتے ہوئے اس کا رشتہ اجتماعیت، انسانیت، مقصدیت اور اخلاقیات سے استوار کیا۔ عام طور پر معاشرے کا سب سے زیادہ حساس اور باشعور طبقہ شعرا کی جماعت ہوتی ہے جو اپنی فطری ذہانت اور حکمت و بصیرت کے ذریعے مستقبل میں آنے والی مشکلات و خطرات کو سب سے پہلے محسوس کرتے ہوئے قوم کو ان سے محفوظ رکھنے کی پیش بندی شروع کرتے ہیں۔ مولانا حالی نے غزلیات اور ہزلیات پر مبنی اپنی شاعری کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہتے ہوئے اس کا رخ قوم و ملت کی اصلاح و تربیت کی طرف موڑ دیا۔ ۱۸۵۷ء کے بلا خیز طوفان کے تھمنے اور ذہنی طور پر کچھ پرسکون ہونے کے بعد جب حالی نے دوبارہ دہلی کا قصد کیا اور یہاں چاروں طرف قوم کی ہلاکت و بربادی کے مناظر دیکھے تو اب ہر آن ان کو یہی فکر دامن گیر رہنے لگی کہ قوم کو اس آفتِ ناگہانی، ادبار و پستی اور افلاس و غربت کے ماحول سے کس طرح نکالا جائے۔ آخر کار ایک عرصے تک غور و فکر اور جہانگیر آباد کے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جیسے سلجھے ہوئے طبیعت کے حامل بلند مرتبہ شاعر کی رفاقت میں چند سال گزارنے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ اس وقت مذہبی، اخلاقی اور سماجی بنیادوں پر قوم کی اصلاح و تربیت کے ذریعہ اس کی خود اعتمادی کو بحال کرنے اور ان کے اندر حرکت و عمل کی روح پھونکنے سے زیادہ ضروری کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیت کو قوم کی اصلاح و تعمیر کے

لیے وقف کردیا۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ عوام نثر کے بالمقابل سادہ اور سہل الفاظ میں کہے گیے اشعار کا اثر جلد قبول کرتے ہیں۔ وہ قوم کی اصلاح و تربیت تو کرنا چاہتے تھے لیکن مقصد تک پہنچنے کے نشان راہ ان پر پوری طرح واضح نہیں تھے، وہ اس شش و پنج میں مبتلا تھے کہ آخر کن خطوط پر قوم کی اصلاح و تربیت کا کام شروع کیا جائے کہ ان کے اندر حرکت و عمل کا جذبہ بیدار ہو، اور ان پر چھائے ہوئے غربت و افلاس، جہالت و ناخواندگی اور یاس و ناامیدی کے بادل چھٹ جائیں! اتفاق سے یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جب انیسویں صدی عیسوی میں برصغیر کے عظیم مصلح، مخلص دانشور، ماہر تعلیم اور قوم و ملت کے مسیحا سرسید احمد خاں علیہ الرحمۃ مسلم قوم کی اصلاح و ترقی کا کام شروع کر چکے تھے۔ انھوں نے قوم کی اصلاح و تربیت اور تعمیر و ترقی کے لیے قوم کے درمیان علم کے فروغ اور خاص طور پر جدید علوم و فنون کی اشاعت کو اپنی کوششوں کا مرکز و محور بنایا اور قوم کی جہالت کو ام الخبائث یعنی ہر طرح کی مذہبی، اخلاقی، سماجی برائیوں اور معاشی بدحالی کا اصل سبب قرار دیا۔ سرسید اپنے اصلاحی افکار و نظریات سے عوام و خواص کو متعارف کرانے کے لیے ذاتی ملاقاتوں اور عوامی تقریروں کے ساتھ اخبارات و رسائل میں مضامین بھی لکھ رہے تھے۔ سرسید کے خیالات سے واقفیت کے بعد مولانا حالی کو محسوس ہوا کہ ذہنی طور پر ان کے اور سرسید کے افکار و نظریات میں بڑی حد تک یکسانیت و ہم آہنگی ہے۔ چنانچہ بلا تاخیر انھوں نے اپنے خوابوں کی تعبیر اور امت مسلمہ کی تعمیر کے لیے سرسید کی تعلیمی تحریک میں شامل ہونے اور ہر طرح سے اس مردِ مجاہد کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا جسے غیروں سے زیادہ اپنوں اور خاص طور پر علماء کرام کی جانب سے شدید مخالفتوں کا سامنا تھا۔ ۱۸۶۸ء میں دہلی کی کسی میٹنگ میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ہمراہ ان کی ملاقات اس عظیم مفکر، مدبر اور مصلحِ قوم و ملت سے ہوئی اور اس ملاقات نے حالی کو ان کی زندگی کا مقصد عطا کردیا اور ان کی شاعری کے رنگ و آہنگ دونوں کو تبدیل کردیا۔ جہاں سرسید کو مولانا حالی کی شکل میں ایک باشعور مخلص رفیق کار مل گیا وہیں حالی کو بھی سرسید کی شکل میں ایک جانثار دوست، مرشد اور میرِ کارواں مل گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ دونوں کے باہمی تعلقات برابر مضبوط ہوتے گیے۔ حالی نے اپنے بعض تحفظات کے باوجود قوم کی اصلاح و تربیت سے متعلق سرسید کے ہر اقدام کو سراہا۔ انھیں اس بات پر شرح صدر تھا کہ سرسید نے قوم کی اصلاح و تربیت کے لیے تعلیمی ترقی کے جس راستے کا انتخاب کیا ہے، موجودہ دور میں اس سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا طریقۂ کار نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ حالی نے اپنے دوسرے دور کی شاعری کو سرسید کے اصلاحی افکار و نظریات کا ترجمان بنادیا اور اس کا رشتہ ہمیشہ کے لیے اجتماعیت، مقصدیت اور صداقت سے جوڑ دیا۔ ان کی آخری چار دہائیوں پر مشتمل شاعری کو اجتماعی یا اصلاحی شاعری کا نام دیا جاسکتا ہے۔ مولانا حالی اپنے مشفق دوست اور پیر و مرشد کی شخصیت کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"..... وہ (سرسید احمد کی شخصیت) ہم کو اسلام کے وہ اعلیٰ اصول یاد دلاتی ہے جن کو قرونِ اولیٰ کے بعد قوم نے بالکل فراموش کردیا تھا اور جن کا مطلب یہ تھا کہ قوم اور وطن کی محبت کو جزوِ ایمان جانو اور قوم کی خدمت کو سرداری کا تمغہ سمجھو! وہ ہم کو سبق دیتی ہے کہ قوم کی حقیقی خیر خواہی اس وقت تک نہیں

ہوسکتی جب تک کہ بہت سے کام ان کی عقل، عادت اور مرضی کے خلاف نہ کیے جائیں اور ان کی مخالفتوں کو صبر و استقلال کے ساتھ نہ برداشت کیا جائے۔ وہ ہم کو آگاہ کرتی ہے کہ اگر دنیا میں بڑا بننا چاہتے ہو تو حرص، طمع، خود غرضی، جھوٹ، آرام طلبی اور عیش و عشرت کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو جاؤ اور وہ ہم کو یقین دلاتی ہے کہ تھوڑی سی تعلیم، بہت سا تجربہ اور بالکل سچائی یہ تینوں مل کر ایسے عظیم الشان کام انجام دے سکتی ہیں جو بڑے بڑے حکیموں اور مدبروں سے انجام نہیں پاسکتے..... اس نے چالیس برس برابر تعصب و جہالت کا مقابلہ کیا، تقلید کی جڑ کاٹی، بڑے بڑے علماء و مفسرین کو لتاڑا، اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا، قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں- اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ ہے اور نہ اس کو ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام مسیحائی سے خالی نہیں تھا''۔(۲)

مولانا حالی نے سرسید کے ہر اقدام کو سراہا اور قوم کو ان کی مخالفت کے بجائے ان کی حمایت اور موافقت کی دعوت دی اور اپنی مختلف نظموں میں قوم کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ جس شخص نے اپنی تمام تر صلاحیتوں اور اپنے تمام مال و اسباب کو قوم کے لیے قربان کر دیا ہے اور جسے سوتے جاگتے قوم کی ترقی و خوش حالی کی فکر دامن گیر رہتی ہے وہ بھلا قوم کا کسی بھی صورت میں برا کیسے چاہ سکتا ہے؟ لہٰذا اس عظیم شخص کے اخلاص، نیک نیتی، صداقت اور راست بازی میں کسی طرح کے شک کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ حالی اپنی ایک نظم میں سرسید احمد کے تئیں اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اس دور آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم
ایک ہاشمی تمہارا مصلح کھڑا کیا ہے
سرسبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں
فتوی سے قوم کے گو کافر ٹھہر چکا ہے
وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال اپنا
یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کر دیا ہے
وار اس پہ قوم کے ہیں وہ قوم کی سپر ہے
قوم اس سے بدگماں ہے وہ قوم پر فدا ہے
درہم سے اور قلم سے دم سے قدم سے اپنے
جو کچھ کیا ہے اس نے وہ کس سے ہوسکا ہے
ہمدردِ قوم ایسا ہم نے سنا نہ دیکھا
یہ درد اس کو جد کی میراث میں ملا ہے
تعلیم کی تمہاری بنیاد اس نے ڈالی
ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے
بعد از قرونِ اولیٰ کس نے کیا بتاؤ
سید نے کام آکر جو قوم میں کیا ہے (۳)

غرضیکہ ۱۸۵۷ء کے بعد قوم کی تباہی، سرسید احمد سے ملاقات، ان کے افکار و نظریات سے اتفاق اور سب سے بڑھ کر دینی، اخلاقی، اجتماعی اور قومی ذمے داری کے شعوری احساس نے حالی کی شاعری کے رخ اور انداز دونوں کو تبدیل کر دیا۔ ان کی آخری چار دہائیوں کی پوری شاعری خواہ غزل، نظم، قطعات، رباعیات، مسدس، مثنوی، قصیدہ و مرثیہ کسی صنف سخن سے تعلق رکھتی ہو وہاں اجتماعیت، انسانیت، اخلاقیات اور قوم سے محبت و ہمدردی کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔

حالی اپنے شروع دور کی غزلیہ شاعری کو مہمل اور لایعنی قرار دیتے ہیں اور اس پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''.....بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اسی ایک چکر میں گھومتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہاں طے کر چکے اور جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں.....''۔(۴)

دینی رجحان، اجتماعی فکر اور قومی سوچ پختہ ہونے کے بعد حالی کو یہ احساس ہوگیا کہ قدیم اردو شاعری کا پورا ذخیرہ ایک ناپاک دفتر اور غزل گو شعرا اپنی بداعمالیوں اور مختلف قسم کی اخلاقی و سماجی برائیوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے جہنم کے حقدار ہیں۔

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے
عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے
مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہ گار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھردیں گے شاعر ہمارے (۵)

اجتماعی اور اصلاحی نوعیت کی ان کی تمام نظموں میں ان کی طویل نظم ''مسدس'' کو امتیازی مقام اور شہرتِ دوام حاصل ہے۔ یہ نظم امتِ مسلمہ کو ترقی و خوشحالی اور اصلاح و ترقی پر ابھارنے کے تئیں ان کے پرخلوص جذبات، سوزِ دروں اور مضطرب دل کی آئینہ دار ہے۔ اس کا ہر بند صداقت و حقیقت، اخلاص و محبت، سلاست و بلاغت اور عبرت و موعظت کا مرقع ہے۔ اس کے اندر انھوں نے جہاں ایک پسماندہ تساہل پسند اور تعیش پسندی کی طرف مائل قوم کے اوصاف شمار کیے ہیں، وہیں تاریخِ انسانی کی زندہ، غالب اور فاتح قوموں کی خوبیوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ اپنی قوم کے سامنے غالب و مغلوب دونوں قوموں کے نمونے پیش کردیے ہیں اور یہ اختیار مسلمانوں پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے لیے کس نمونے کو پسند کرتے ہیں۔ انھوں نے امت مسلمہ کو ان کے شاندار ماضی اور اسلاف کے حیرت انگیز کارناموں کی جھلک دکھلا کر ان کے عزم و حوصلے کو ابھارنے اور اپنی غلطیوں و کوتاہیوں کو سدھارنے کی دعوت دی ہے۔ اس دنیا میں باعزت، پروقار اور خوش حال زندگی گذارنے کے گر بتائے ہیں اور سب سے زیادہ زور تعلیمی ترقی اور معاشی خوش حالی حاصل کرنے پر دیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک غربت و جہالت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ ۱۸۷۹ء میں سرسید احمد کی تحریک پر کہی گئی یہ طویل نظم درحقیقت ایک تاریخی دستاویز، اردو شاعری کا شاہ کار اور اجتماعی اصلاح و تربیت کا نسخۂ کیمیا ہے۔ اور سرسید نے تو اسے اپنے لیے ایسا توشۂ آخرت بتایا جس کے ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی مغفرت کی درخواست کرسکتے ہیں۔ سردار جعفری کہتے ہیں:

''مسدس حالی اردو زبان کی پہلی ایسی نظم ہے جسے ہم عظیم کہہ سکتے ہیں۔ اس نے اردو شاعری کے دھارے کو موڑ دیا، اس میں شک نہیں کہ یہ اردو میں پچھلے سو سال کی بہترین مسلسل بیانیہ نظم ہے''۔(۶)

اسی طرح بیسویں صدی میں عالمی شہرت کے حامل فارسی ادبیات کے ادیب، محقق، ناقد اور دانشور پروفیسر نذیر احمد لکھتے ہیں:

''حالی بڑے پائے کے نقاد، شاعر، ادیب، انشا

پرداز اور مورخ تھے اور ان سارے امور میں ان کے زمانے میں ان کا کوئی ہم پلہ نہ رہا ہوگا وہ اردو زبان میں نقد نویسی کے بانی تھے اور بعض اعتبار سے اب تک کوئی ان کا ہم پلہ نہیں ہوا ہے۔ ان کی مشہور تصنیف ''مقدمہ شعر وشاعری'' ایک نہایت ہی مہذب، متمدن اور شائستہ ذہن کا عکس ہے۔ ان کی شخصیت کا بہترین اظہار ان کی تنقیدی زبان اور اسلوب میں ہوا ہے جس کی تعریف میں سارے نقاد رطب اللسان ہیں۔ وہ صرف نقاد ہی نہیں بلکہ بڑے شاعر بھی تھے۔ ان کی مشہور نظم مسدس حالی ایسی پرجوش، عبرت انگیز، سبق آموز اور غیرت دلانے والی نظم ہماری کسی زبان میں نہیں۔ یہ نظم ہماری قومی زندگی کا کامل مرقع ہے۔ اس کی درد بھری آواز ہمیشہ دلوں کو تڑپاتی رہے گی، اس میں ایسے تیر و نشتر ہیں جو جگر کے پار ہو جاتے ہیں ...''۔(۷)

مسدس حالی آج بھی کسی حد تک ہمارے مسلم معاشرے کے حسب حال معلوم ہوتی ہے۔ اسے پڑھ کر آج بھی ایک عجیب قسم کی تر و تازگی کا احساس اور قوم وملت کے لیے دل میں کچھ کر گذرنے کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ حالی نے اردو شاعری کی تجدید وتطہیر کی جس تحریک کو شروع کرتے ہوئے اس کے اندر اجتماعیت کو شامل کرنے کی پرزور دعوت دی تھی اسی تحریک کو بیسویں صدی کے اواخر میں ادب اور شاعری کی روح سے تعبیر کیا گیا۔ مولانا حالی نے اس کے مقدمے میں مسدس کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے قوم کی دینی، اخلاقی، معاشی و معاشرتی بگاڑ کی تصویر پیش کی ہے اور قوم کو اقدام وعمل کی دعوت دی ہے:

''..........قوم کی حالت تباہ ہے، عزیز ذلیل ہو گیے ہیں، شریف خاک میں مل گیے ہیں، علم کا خاتمہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے، افلاس کی گھر گھر پکار ہے، اخلاق بالکل بگڑ گیے، رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے، امرا غافل اور بے پروا ہیں۔ علما زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔...... ایسی تنگ حالت میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو طرح کے خیال گذرتے ہیں ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے، پہلے خیال کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے۔ ہمارے ملک کے اہلِ مذاق ظاہر ہے اس روکھی پھیکی سیدھی سادی نظم کو پسند نہ کریں گے کیونکہ اس میں تاریخی واقعات ہیں یا چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ ہے یا آج کل جو قوم کی حالت ہے اس کا صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے، نہ کہیں نازک خیالی ہے، نہ رنگیں بیانی، نہ مبالغہ کی چاٹ ہے نہ تکلف کی چاشنی ہے......اس نظم کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لیے نہیں کی گئی ہے بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت دلانے کے لیے کی گئی ہے......''۔(۸)

اسی طرح مولانا حالی نے اپنی دوسری شہرہ آفاق کتاب ''مقدمہ شعر وشاعری'' کے اندر بھی شاعری کی اجتماعی و اخلاقی بنیادوں کی وضاحت کی ہے اور ایسی شاعری کو مہمل قرار دیا ہے جس کا تعلق سماج کے مسائل اور اجتماعیت سے نہ ہو۔ وہ اردو کے مدحیہ قصائد پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان میں ایک نام کے سوا کوئی ایسی خصوصیت نہیں جو ممدوح کی ذات کے ساتھ مختص ہو، اسی طرح قدیم مثنویوں میں عجائب وغرائب اور خرافات پر مبنی قصوں کا بھی انسانی معاشرے اور حقائق کی دنیا سے دور کا واسطہ نہیں۔ (۹) اب میں مولانا الطاف حسین حالی

کی شاعری میں اجتماعیت سے متعلق بعض اہم عناصر کی نشاندہی کرنے کی کوشش کروں گا۔

حقیقت وصداقت

مولانا حالی شاعری کا رشتہ صداقت اور حقیقت سے جوڑنا چاہتے ہیں جو اجتماعیت کی روح ہے۔ وہ شعرا کو بار ہا راست گوئی اور حقیقت پسندی کا راستہ اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں کیونکہ جھوٹ کی وجہ سے شاعری میں تملق، خوشامد پسندی، مبالغہ آرائی اور دیگر اخلاقی وسماجی برائیاں جگہ بنالیتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ سامعین کو بھی جھوٹی داستانوں میں مزہ آنے لگتا ہے۔ اس طرح شعرا پوری قوم کے مزاج کو فاسد کردیتے ہیں۔ حالی لکھتے ہیں:

''.....مگر شاعری جب بگڑ جاتی ہے تو اس کی زہریلی ہوا سوسائٹی کو بھی نہایت سخت نقصان پہنچاتی ہے۔ جب جھوٹی شاعری کا رواج تمام قوم میں ہوجاتا ہے تو پھر جھوٹ اور مبالغے سے سب کے کان مانوس ہوجاتے ہیں، جس شعر میں زیادہ جھوٹ اور مبالغہ ہوتا ہے اس کے شاعر کو زیادہ داد ملتی ہے تو وہ مبالغہ میں اور غلو کرتا ہے تاکہ اور زیادہ داد ملے..... حقائق و واقعات سے لوگوں کی مناسبت روز بہ روز کم ہوتی جاتی ہے، جھوٹے قصے اور افسانے حقائق واقعیہ سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں اور جب جھوٹ شاعری کے قوام میں داخل ہوجاتی ہے تو قومی اخلاق کو گھن لگ جاتا ہے.....''۔(۱۰)

مولانا حالی نے مقدمۂ شعر وشاعری کے پہلے تہائی حصے میں سارا زور اردو شاعری میں اجتماعی واخلاقی قدروں کو شامل کرنے پر دیا ہے، اور شاعری میں حقیقت وصداقت پر مبنی اصولوں کے دوررس تعمیری واخلاقی اثرات کا ذکر کیا ہے۔ حالی نے اپنی نظموں میں حق گوئی کی بارہا تاکید کی ہے۔ تاریخ انسانی کے ہر دور میں مصلحین کو حق گوئی کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ وہ اپنی مشہور نظم ''کلمۃ الحق'' میں اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اے راست گوئی کیا قہر ہے تو
اے حق کی تلخی کیا زہر ہے تو
شئے کوئی تجھ سے کڑوی نہ ہوگی
حنظل میں ایسی تلخی نہ ہوگی
سقراط کو زہر تو نے دلایا
شبیر کو قتل تو نے کرایا
موسیٰ کو مدین میں تو نے بھگایا
احمد سے مکہ تو نے چھڑایا
یہاں نام تیرا جس نے لیا ہے
عالم کو اپنا دشمن کیا ہے (۱۱)

حالی نے ایسے شعرا کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو مبالغہ آرائی اور کذب گوئی کو شاعری کی شان اور جان تصور کرتے تھے۔ ان کا ماننا ہے کہ اس طرح کے منفی رجحان سے زبان تو تباہ ہوتی ہی ہے قوم کے اخلاق اور مذاق پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ شاعری میں جوش اور تاثیر صداقت سے پیدا ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ حالی نے تصنع، تکلف، مبالغہ آرائی کے بجائے ہمیشہ سادگی اور راست گوئی کو ترجیح دی ہے۔ وہ شعر کے عنوان سے اپنی مشہور نظم میں اچھے شعر کی خصوصیات کو شمار کرتے ہوئے شعرا کو راہِ راست پر چلنے اور قوم وملت کی خدمت کرنے کی دعوت دیتے ہیں:

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں

پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو
وہ دن گیے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری
قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجو نماز تو
چپ چاپ اپنے سچ سے کیے جادلوں میں گھر
اونچا ابھی نہ کر علم امتیاز تو
عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا
محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو
اے شعر راہِ راست پر تو جب کہ پڑگیا
اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو (۱۲)

مولانا حقیقت اور صداقت سے عاری شاعری کو بے جان جسم تصور کرتے ہیں اور ہر حال میں راستی کو اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں:

''..... جہاں تک ممکن ہو حقیقت وراستی کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ زمانے کا اقتضا یہ ہے کہ جھوٹ، مبالغہ، بہتان، افترا، خوشامد، مدعا بے معنی، تعلّی بے جا، الزام لایعنی، شکوہ بے محل اور اس قسم کی باتیں جو صدق و راستی کے منافی ہیں ان سے جہاں تک ممکن ہو قاطبۃ احتراز کرنا چاہیے.....''۔(۱۳)

اصالت نفس

مولانا حالی شاعری میں شاعر کی ذاتی زندگی کے تجربات ومشاہدات کی جھلک دیکھنا چاہتے ہیں اور اسے لایعنی موشگافیوں اور لن ترانیوں سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔ حالی ایک دردمند دل رکھتے ہیں اور ہمیشہ اپنے دلی جذبات اور ذاتی مشاہدات کو ہی اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے دلی کرب والم کو قارئین کے دلوں تک اسی شدت کے ساتھ منتقل کرنے میں کامیاب ہیں جیسا کہ وہ خود محسوس کرتے ہیں۔ ان کی مشہور نظم ''مناجاتِ بیوہ'' کا شمار ان نظموں میں ہوتا ہے جس میں وہ اپنے دلی کرب اور ذاتی احساسات کو قاری تک ہو بہو منتقل کردیتے ہیں۔ وہ ایک قطعہ میں اسی خاصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اب کہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ امنگ
سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی
آپ بیتی نہ ہو جو وہ کہانی بے لطف
گرچہ ہو لفظ فصیح اور زبان ٹکسالی
کھینچیے وصل صنم کی بھی فرضی تصویر
کیجیے درد جدائی کی بھی نقالی (۱۴)

اخلاقیات

مولانا حالی کے دوسرے دور کی پوری شاعری کو ہم اخلاقیات سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ حالی نے شاعری کا رشتہ اخلاق سے جوڑتے ہوئے اشعار میں مکارمِ اخلاق کی تعلیم و ترویج سے متعلق موضوعات کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ اخلاقیات کو شعر کا لازمی جز قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شعر کا اخلاق کے ساتھ صریح تعلق ہے جس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ شعر اگرچہ براہِ راست علم اخلاق کی طرح تلقین وتربیت نہیں کرتا لیکن ازروئے انصاف اس کو علم اخلاق کا قائم مقام اور نائب مناب کہہ سکتے ہیں۔ اسی بنا پر صوفیا کے ایک جلیل القدر سلسلے میں سماع کو جس کا جزوِ اعظم اور رکنِ رکین شعر ہے وسیلہ قرب الٰہی اور باعثِ

تصفیۂ نفس اور تزکیۂ باطن مانا گیا ہے''۔(۱۵)

فرد اور معاشرے کی انفرادی و اجتماعی اصلاح کا بڑی حد تک دار و مدار اخلاقیات پر ہے۔ حالی کو یہ دیکھ کر کافی رنج ہوتا ہے کہ پوری دنیا کو مکارمِ اخلاق اور تہذیب و تمدن کا درس دینے والی قوم آج خود بے شمار اخلاقی و سماجی برائیوں کی شکار اور غیر دینی رسوم و رواج کی بیڑیوں میں جکڑ چکی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اخلاقی کمزوریوں کو دور کیے بغیر امت مسلمہ کے لیے ترقی و کامیابی کے راستے نہیں کھل سکتے۔ مولانا حالی کے بیشتر قطعات، رباعیوں کا موضوع اخلاقیات ہے اور مسدس حالی تو پورا کا پورا مکارمِ اخلاق کا چارٹر ہے۔ مولانا مانتے ہیں کہ مسلمانوں کے اخلاقی زوال کا ایک بڑا سبب ان کی غربت اور معاشی بدحالی ہے کیونکہ غربت میں کسی عام انسان کا ایمان و اخلاق پر قائم رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

فلاکت جسے کہتے ہیں ام الجرائم
نہیں رہتے ایماں پہ دل جس سے قائم
بناتی ہے انساں کو جو بہائم
مصلی ہے دل جمع جس سے نہ صائم
کہیں مکر کے گر سکھاتی ہے ہم کو
کہیں جھوٹ کی لو لگاتی ہے ہم کو
خیانت کی چالیں سجھاتی ہے ہم کو
خوشامد کی گھاتیں بتاتی ہے ہم کو (۱۶)

حالی نے معاشرے میں رائج ذات پات، رنگ و نسل کی بنیاد پر موجود تعصبات و تفریقات کو ختم کر کے عالمی انسانیت اور اسلامی اخوت و محبت کی بنیاد پر باہمی انسانی و اجتماعی رشتوں کو مضبوط کرنے پر زور دیا ہے۔

ذات کا فخر اور نسب کا غرور
اٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور
جعفری ہو یا کہ حنفی
جین مت ہو یا بیشوئی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو
سمجھو آنکھ کی پتلیاں سب کو (۱۷)

ایک اہم انسانی و سماجی کمزوری یعنی مایوسی و ناامیدی کو وہ کفر کے مترادف سمجھتے ہیں اور اپنی قوم کو ہر حال میں اپنے دلوں میں امید کی شمع جلائے رکھنے کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ دنیا میں وہی قومیں غلبہ و اقتدار حاصل کرتی ہیں جن کے دلوں میں کچھ کر گذرنے کا عزم و حوصلہ زندہ ہوتا ہے۔ وہ امید کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں
اکھڑتے دلوں کو جمایا ہے تو نے
اجڑتے گھروں کو بسایا ہے تو نے
بہت تو نے پستوں کو بالا کیا ہے
اندھیرے میں اکثر اجالا کیا ہے (۱۸)

اسی طرح حالی نے قوم کو اپنی صفوں میں باہمی اتحاد و اتفاق کی جڑوں کو مضبوط کرنے اور برادران وطن کے ساتھ بھی بھائی چارگی اور خوشگوار تعلقات استوار کرنے کی تلقین کی ہے۔ انھوں نے تاریخی حقائق کی روشنی میں بتایا ہے کہ اس دنیا میں ترقی یافتہ قوموں کی قوت و ترقی کا راز اسی اتحاد میں پوشیدہ ہے اور افتراق کی صورت میں ان کو ہلاکت و بربادی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ اسی طرح وہ مذہب و مسلک کی بنیاد پر موجود

اختلافی مسائل سے قوم کو دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ مناظرے اور باہمی اختلافات کسی مسئلے کا حل نہیں ہیں۔

پر نہیں رابطہ جس قوم میں اور یکجہتی
اس کی دنیا سے یہ سمجھو کہ گئی عزت و جاہ
نہ ملاذ ان کے لیے قلعہ نہ خندق نہ فصیل
نہ مفید ان کے لیے فوج نہ لشکر نہ سپاہ (۱۹)
غیر ممکن ہے کہ اٹھ جائیں دلیل و بحث سے
جو چلا آتا ہے باہم مذہب میں خلاف
ہو نہیں سکتا مطابق جب کہ دو گھڑیوں کا وقت
رفع ہو سکتے ہیں کیونکر ہزاروں اختلاف (۲۰)

بخل حالانکہ ایک اخلاقی واجتماعی برائی ہے اور اسلام کے نزدیک ایک مذموم فعل ہے، لیکن قوم کی غربت و زبوں حالی کو دیکھتے ہوئے انھوں نے بخل سے نفرت کے بجائے قوم کے افراد واغنیا کو اسراف سے بچنے کی اپنے اشعار میں بارہا تاکید کی ہے۔

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اس کا سبب کیا
جب کرتے ہو تم کرتے ہو مسرف کی مذمت
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اس کا
یاروں کے لیے ہے یہ جہاں موجب رقت
کرتے تھے بخیلوں کی ملامت سلف اس وقت
جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت
اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال
گھر گھر پر ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت
ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی
پرواز کی ہے چیونٹیوں کو جیسے ہدایت (۲۱)

مولانا حالی کا ماننا ہے کہ اغیار کے بالمقابل ان کی قوم میں غربت اور بدحالی بہت زیادہ ہے لہٰذا وہ ان کے لیے اسراف اور سخاوت کے بجائے کفایت شعاری کو ضروری سمجھتے ہیں اور آج بھی صورت حال کوئی زیادہ تبدیل نہیں ہوئی ہے بلکہ مختلف اسباب کے بنا پر بعض علاقوں میں تو مسلمانوں کی معاشی حالت اور زیادہ خراب ہوئی ہے۔ قوم کی غربت وافلاس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یہاں جتنی قومیں ہمارے سوا ہیں
ہزار ان میں خوش ہیں تو دو بے نوا ہیں
یہاں لاکھ میں دو اگر اغنیا ہیں
تو سو نیم بسمل ہیں باقی گدا ہیں
یہ اے قوم اسلام عبرت کی جا ہے
کہ شاہوں کی اولاد اور گدا ہے
جسے سنیے افلاس میں مبتلا ہے
جسے دیکھیے مفلس و بے نوا ہے (۲۲)

تعلیم

ملک میں مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالات اور ان کی بدحالی و بے بسی کو دیکھ کر مولانا حالی نے محسوس کیا کہ موجودہ حالات میں تعلیم کے سوا اور کوئی ایسا راستہ مسلمانوں کے سامنے باقی نہیں بچا ہے جس کے ذریعے وہ اپنی پستی وذلت کے داغ کو دھو سکتے ہیں اور معاشرے میں اپنی کھوئی ہوئی عزت وعظمت کو حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی ترقی وخوش حالی کے ضمن میں سرسید کے تعلیمی منصوبوں سے پوری طرح اتفاق رکھتے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کی تمام تر مذہبی، سماجی،

اجتماعی اور تہذیبی اصلاح اور معاشی ترقی وخوشحالی کی بنیاد تعلیم پر رکھی ہے۔ انھوں نے اپنی متعدد نظموں میں اور خاص طور پر مسدس کے اندر کبھی رغبت، کبھی غیرت، کبھی عبرت، کبھی موعظت غرضیکہ مختلف طریقوں سے قوم کے اندر تعلیم کا شوق بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے جابجا اپنی نظموں میں جدید سائنسی علوم وفنون میں مسلمانوں کو پیش رفت کرنے کی دعوت دی ہے اور اس ضمن میں سرسید کے تعلیمی اقدامات کو سراہا ہے۔ حالی کے ان اشعار کی معنویت وافادیت آج بھی کچھ کم نہیں ہوئی ہے اور مسلم قوم کو تعلیم کے میدان میں اسی پیش رفت کی ضرورت ہے جتنی حالی کے دور میں تھی کیونکہ آج بھی جدید علوم وفنون کے میدان میں اہل وطن کے بالمقابل مسلمانوں کا حصہ دو یا تین فی صد سے زیادہ نہیں ہے۔ اور قوم کے پاس تعلیم کے علاوہ ترقی اور خوشحالی کا کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں بچا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

حکومت سے مایوس تم ہو چکے ہو
زر و مال سے ہاتھ تم دھو چکے ہو
مدار اب فقط علم پر ہے شرف کا
کہ باقی ہے ترکہ یہی ایک سلف کا
ہمیشہ سے جو کہتے آئے ہیں
سب یاں کہ ہے علم سرمایہ فخر انساں
یہ اب بحر و بر دے رہے ہیں گواہی
کہ ہے علم میں زور دست الٰہی
کیا علم نے ان کو ہر فن میں یکتا
نہ ہمسر رہا ان کا کوئی نہ ہمتا
اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال
غائب ہوا تو جہاں سے وہاں آیا زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے رأس المال (۲۳)

مولانا حالی نے سلف صالحین کی عزت وعظمت او رحکومت و جہانبانی کا راز علوم وفنون کے میدان میں ان کی گراں قدر خدمات کو قرار دیا ہے۔ انھوں نے صرف اسلامی علوم وفنون ہی نہیں بلکہ سائنسی علوم کے میدان میں بھی اپنی سبقت، مہارت اور عظمت کے انمٹ نقوش ثبت کیے تھے اور سائنس کے میدان میں صرف مشرق ہی نہیں بلکہ مغرب کی قیادت کا سہرا بھی ان کے سر ہے۔ انھوں نے اسلامیات کے ساتھ جدید سائنسی ومغربی علوم کے میدان میں بھی قوم کو آگے بڑھنے کی دعوت دی ہے کیونکہ موجودہ دور میں ہر چھوٹے بڑے فن کے اندر مشق وممارست کی ضرورت پڑتی ہے یہاں تک کہ نجاری ومعماری جیسے پیشوں کے لیے بھی تربیت کی ضرورت ہے۔ حالی نے اس دور میں جو پیشین گوئی کی تھی وہ آج کے اس دور میں صادق آرہی ہے کہ اب چھوٹی سے چھوٹی نوکری کے لیے بھی کم ازکم ہائی اسکول کی لیاقت ضروری ہے۔ اسلاف کے علمی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا
فلاطون کو زندہ پھر کر دکھایا
ہر ایک شہر و قریہ کو یوناں بنایا
مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا
زمانے میں طب پھیلی ان کی بدولت
ہوئی بہرہ ور جس سے ہر قوم و ملت
نہ صرف ایک مشرق میں تھی ان کی شہرت

مسلم تھی مغرب تک ان کی حذاقت (۲۴)

حالی موجودہ دور میں جدید علوم وفنون کی ضرورت، افادیت اور اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں:

نتائج ہیں جو مغربی علم و فن کے
وہ ہیں ہند میں جلوہ گر سو برس سے
تعصب نے لیکن یہ ڈالے ہیں پردے
کہ ہم حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے
وہ تیلی کے کچھ بیل سے کم نہیں ہیں
پھرے عمر بھر اور جہاں تھے وہیں ہیں
نہ سرکار میں کام پانے کے قابل
نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
نہ جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل
نہ بازار میں بوجھ اٹھانے کے قابل
نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر
وہ کھوئے گئے اور تعلیم پاکر (۲۵)

حالی ہر چھوٹے بڑے فن کے لیے تعلیم وتربیت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ضرورت علم ودانش کی ہے ہر فن اور صناعت میں
نہ چل سکتی ہے اب بے علم نجاری نہ معماری
جہاں تک دیکھیے تعلیم کی فرمانروائی ہے
جو سچ پوچھو تو اوپر علم ہے نیچے خدائی ہے (۲۶)

حالی کا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ قوم کا دین و ایمان، اس کی تہذیب وثقافت، اس کی عزت وشہرت، اس کی کامیابی وترقی، اس کی آسودگی وخوشحالی کی ضمانت صرف اس کی تعلیمی ترقی میں مضمر ہے۔ ان کے یہاں دینی ودنیوی تعلیم کی کوئی تفریق نہیں ہے بلکہ وہ جدید علوم کے حصول پر زیادہ زور دیتے ہیں:

قوم اس وقت ہے تعلیم کی جتنی محتاج
ہے وہ عالم پہ ہویدا نہیں محتاج بیاں
عزت و آسودگی اور ملت و مذہب ان کا
ہو نہ تعلیم تو ہیں سب کچھ دن کے مہماں
یہی قوت ہے کہ ہوتے ہیں قوی جس سے ضعیف
یہی حکمت ہے کہ ہوتے ہیں سبک جس سے گراں (۲۷)

محنت و عمل

مولانا حالی مذہبی و سماجی اصلاح کے ضمن میں تصوف وطریقت یا دنیا سے علیٰحدگی اختیار کرنے کے بجائے مسلمانوں کو محنت وعمل کی دعوت دیتے ہیں اور تعلیم کے بعد قوم کی ترقی وخوشحالی کا دوسرا اہم ستون تدبیر اور جدوجہد کو قرار دیتے ہیں۔ حالی انسان کو مجبور محض اور تقدیر کا اسیر نہیں سمجھتے۔ تقدیر پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت پر بھروسہ کرتے ہوئے جفاکشی کی زندگی اختیار کرے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں ایسے واعظین کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو قوم کو قناعت پسندی اور دنیوی امور سے علیٰحدگی اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ حالی کی شاعری کا بڑا ذخیرہ قوم کو محنت وعمل پر ابھارنے سے متعلق ہے۔

جبریہ قدریہ کی بحث و تکرار
دیکھا تو نہ تھا کچھ اس کا مذہب پر مدار
جو کم ہمت تھے ہوگئے وہ مجبور
جو باہمت تھے بن گئے وہ مختار (۲۸)

حالی اس دنیا میں عزت وشہرت، غلبہ واقتدار اور

کامیابی وترقی کی کلید محنت کو قرار دیتے ہیں۔

تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی جو کل نہ ڈوبی
یہ برکت ہے دنیا میں محنت کی ساری
جہاں دیکھئے فیض اس کا ہے جاری
یہی ہے کلید در فضل باری
اسی پر ہے موقوف عزت تمہاری (۲۹)

تعلیم نسواں

مولانا حالی کی اجتماعی شاعری کا ایک اہم عنصر ہندوستانی معاشرے میں از روئے انسانیت اور از روئے شریعت عورتوں کے جائز دینی، انسانی اور معاشرتی حقوق کی بازیابی کے لیے عملی جدوجہد ہے۔ مولانا حالی ہندوستانی معاشرے میں عورتوں پر ہونے والے مظالم اور زیادتیوں سے بے حد رنجیدہ اور کبیدہ خاطر تھے۔ ان کا یہ درد ان کی نظم ''چپ کی داد'' ''مناجاتِ بیوہ'' اور ''بیٹیوں کی نسبت'' میں پوری طرح نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ غیر اسلامی اور غیر انسانی رسوم و رواج کی بنا پر ہندوستانی معاشرے میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی ظلم و زیادتی اور اس کی مظلومی و بے بسی کی پر درد تصویر کھینچتے ہوئے قوم کو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کا عزت واحترام کرنے کی دعوت دیتے ہیں کیونکہ قوم کی اصلاح وتربیت کا بہت حد تک انحصار اسی صنف نازک کے کندھوں پر ہے اور بچے کی اولین تربیت گاہ تو ماں کی گود ہے۔ ماں کی حیثیت سے عورت کے بلند ترین مقام کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج پوری انسانیت اس کی رہین منت ہے کیونکہ اس دنیا میں انبیاء کرام اور مصلحین عظام سے لے کر عام آدمی کو جنم دینے والی عورت ہی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

لیتیں خبر اولاد کی مائیں نہ گر بچپن میں یاں
خالی کبھی کانسل سے آدم کی ہوجاتا جہاں
وہ دین اور دنیا کے مصلح جن کے وعظ و پند سے
ظلمت میں باطل کی ہوا ، دنیا پر نور حق عیاں
کیا صوفیانِ باصفا کیا عارفانِ با خدا
کیا انبیا کیا اولیا کیا غوث ، کیا قطب زماں (۳۰)

مولانا حالی عورتوں کے احسانات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے لیے عدل ومساوات اور تعلیم وتمدن کے میدان میں ترقی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ انھوں نے عورتوں کے لیے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی بھی حمایت کی اور اس ضمن میں عملی اقدامات بھی کیے۔ وہ مردوں کی اس تنگ نظری اور نفسیاتی کیفیت کی عکاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں جو عورتوں کو ہر طرح کی تعلیم سے دور رکھنا چاہتے ہیں مبادا وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کرنا نہ شروع کردیں:

جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں
آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آب حیات
ٹھہرا تمہارے حق میں زہر ہلاہل سر بسر
دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب
تم پر مبادا علم کی پڑجائے پرچھائی کہیں
ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق
تعلیم پاکر آدمی بننا تمھیں زیبا نہیں (۳۱)

حالی ایک دوسری جگہ انسانیت پر عورت کے گراں قدر احسانات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں قوموں کی عزت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں ایماں سلامت تم سے ہے

زمانے کی موافقت

مولانا حالی کی اجتماعی شاعری کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے مذہبی دلائل، تاریخی شواہد اور پھر اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں زمانے کی موافقت کو قوم کی اصلاح و ترقی کا ایک اہم منتر قرار دیا ہے اور خبردار کیا ہے کہ وقت کے تقاضوں کو نظر انداز کرنے والی اور زمانے کے اشاروں کو نہ سمجھنے والی قوم کے لیے اس دنیا میں ایک کامیاب، باعزت اور خوشحال زندگی گذارنے کے امکانات معدوم ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اگر سمتِ مخالف میں چلنے کی سکت نہ ہو تو کشتی کو ہوا کے رخ پر ڈال دینا ہی دین داری اور دانش مندی ہے۔ اور ہر دور کے حالات اور تقاضے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ موجودہ دور میں اسلاف کے طور طریقوں کو اپنانا حکمت کے خلاف ہوگا۔ انھوں نے 'الدین یسر" کے نظریے کی بنیاد پر اعتدال کا راستہ اختیار کرنے کی دعوت دی ہے۔ (۳۲) وہ کہتے ہیں:

زمانہ دیر سے چلا رہا ہے اے مسلمانو!
کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز اسے پہچانو
سنے ہوں گر نہ معنی "لاتسبوالدھر" کے تم نے
تو اب سن لو کہ ہوں میں شان ربانی مجھے جانو
وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے
اگر میری نہ مانو گے تو پچھتاؤ گے نادانو (۳۳)

اس ضمن میں مولانا حالی اپنے رفیق کار سرسید احمد کی رائے سے بالکلیہ اتفاق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنی اصلاحی تحریک کی بنیاد ہی اس اصول پر رکھی تھی کہ مسلمانوں کی ترقی و کامیابی کا واحد راستہ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیل کرلیں۔ اسی بنیاد پر انھوں نے انگریزوں کی مخالفت کے بجائے ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے اور ان کے ساتھ تعاون کرنے کی دعوت دی اور زمانے سے مطابقت اختیار کرتے ہوئے ہی موجودہ دور میں اسلامی علوم کے بجائے موجودہ مغربی و سائنسی علوم کو حاصل کرنے پر زور دیا۔ حالی نے بھی "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" کے اصول کو اپنایا۔

زمانے کا دن رات ہے یہ اشارا
کہ ہے آشتی میں میری یاں گذارا
نہیں پیروی جن کو میری گوارا
مجھے ان سے کرنا پڑے گا کنارا
سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی (۳۴)

حب الوطنی

۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی کے بعد شمالی ہندوستان کے عوام اور بالخصوص مسلمانوں کو انگریز حکمرانوں کے وحشیانہ مظالم اور ان کی انتقامی کاروائیوں کا نشانہ بننا پڑا۔ انگریزوں کی دن بہ دن بڑھتی ہوئی ظلم و زیادتی نے اندر ہی اندر تمام ہندوستانیوں کے دلوں میں قوم و وطن سے محبت اور انگریزوں سے نفرت کے جذبات کو پروان چڑھایا۔ مولانا الطاف حسین حالی کی شاعری بھلا حب الوطنی کے اس فطری

اوراجتماعی جذبے سے کیوں اچھوتی رہتی۔انھوں نے انگریزی تعلیم اورانگریزی حکومت کی حمایت ضرور کی مگر دل سے ہمیشہ ملک و وطن کومحکومی اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے خواہش مند رہے اور وطن سے محبت کو ایمان کا جز قرار دیا۔ وہ کہتے ہیں:

تیری ایک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہر گز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا
کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا (۳۵)

حالی کے نزدیک حب الوطنی کا مفہوم تمام اہل وطن سے بلا اختلافِ مذہب وملت اور بلاتفریقِ رنگ ونسل اخوت و محبت کا برتاؤ کرنا ہے اور ذاتی غرض ومنفعت سے اوپر اٹھ کر ہر حال میں قوم وملک کے مفاد کو ترجیح دینا ہے۔ وہ قوم کے ہر فرد کے اندر باہمی اتفاق وتعاون کا اجتماعی شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ ماضی کی ترقی یافتہ قومیں حب الوطنی کے اسی جذبے کی بنا پر عزت وترقی کے اعلیٰ مقام پر پہنچنے میں کامیاب ہوئیں۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو
سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد
شہر ہیں اتفاق سے آباد
گر رہا چاہتے ہو عزت سے
بھائیوں کو نکا لو ذلت سے
قوم دنیا میں جس کی ہے ممتاز
ہے فقیری میں بھی وہ با اعزاز۔
(۳۶)

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں:

ترقی کے یونان کے اسباب کیا تھے
ہنر پر جہاں پیرو برنا فدا تھے
تمدن کے میدان میں زور آزما تھے
وطن کی محبت میں یکسر فنا تھے۔ (۳۷)

بہر حال مولانا الطاف حسین حالی کی پوری شاعری ان کے دینی رجحان، قومی احساس اور اجتماعی شعور کی غماز ہے۔ اس مختصر جائزے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی آخری چار دہائیوں پر مشتمل شاعری کو کبھی شہرت وناموری یا جاہ ومنصب کے حصول کا زینہ نہیں بنایا بلکہ اس کے ذریعے پوری صداقت وامانت اور اخلاصِ نیت کے ساتھ مسلم قوم کی اصلاح وترقی کی کوشش کی اور اسے جہالت و ناخواندگی اور غربت و بدحالی کی ذلت سے نکال کر باعزت قوموں کی صف میں کھڑا کرنے کی جدوجہد کی۔انھوں نے اپنی قوم کو تساہلی، تن آسانی اور حد سے زیادہ قناعت پسندی کی عادت کو ترک کرتے ہوئے اقدام وعمل کی دعوت دی۔انھوں نے دیگر شعرا کو بھی قوم کی اصلاح وترقی کو اپنی شاعری کا موضوع اور مقصد بنانے کی تلقین کی اور اس طرح انھوں نے اردو شاعری کا رشتہ جدیدیت، مذہبیت، مقصدیت، اجتماعیت، حقیقت اور اخلاقیات سے استوار کر دیا اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے معاصر شعرا کے برخلاف ان کے اشعار کی معنویت، افادیت اور اہمیت موجودہ دور میں بھی کم نہیں ہوئی ہے۔ان

کے اشعار کے ذریعے آج بھی قوم وملت کی اصلاح وتربیت اور رہنمائی کا کام لیا جاسکتا ہے۔

مراجع و مصادر:

(۱) حالات زندگی کی تفصیل کے لیے:
-حالی بحیثیت شاعر، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ص ۳۰-۹۳، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۰ء
-تذکرۂ حالی، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور، ۱۹۵۴ء
-یادگار حالی، صالحہ عابد حسین، دہلی، ۱۹۵۰ء
-حالی کے سوانح، ڈاکٹر خلیق انجم، ص ۴۵-۱۲۵، الطاف حسین حالی-تحقیقی وتنقیدی جائزے
-تاریخ ادب اردو، پروفیسر نورالحسن نقوی، ص ۱۵۳-۱۵۵۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۱۲ء
(۲) حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، ص ۲۲-۲۷، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، آر کے پورم، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء
(۳) کلیات حالی، مولانا الطاف حسین حالی، ، ص ۱۷۱، فرید بکڈپو، پرائیوٹ لمیٹڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۲۰۰۸ء
(۴) مقدمہ مسدس حالی، مولانا الطاف حسین حالی، ص ۵، فرید بکڈپو، پرائیوٹ لمیٹڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۲۰۰۸ء
(۵) مسدس حالی، ص ۲۷
(۶) حالی بحیثیت شاعر، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ، ص ۲۶۹، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۶۰ء
(۷) الطاف حسین حالی: تحقیقی وتنقیدی جائزہ ، مرتب: پروفیسر نذیر احمد ، ص ۱۲، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۲۰۰۲ء
(۸) مقدمہ مسدس حالی ، مولانا الطاف حسین حالی، ص ۶-۸ (۹) مقدمہ شعر وشاعری، الطاف حسین حالی، ص ۱۴۴-۱۴۹، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۱ء (۱۰) مقدمہ شعروشاعری، ص ۱۰۲
(۱۱) کلیات حالی، مولانا الطاف حسین حالی، ص ۴۱
(۱۲) کلیات حالی، ص ۱۸
(۱۳) مقدمہ شعروشاعری، ص ۲۷
(۱۴) کلیات حالی، ص ۱۹ (۱۵) مقدمہ شعروشاعری، ص ۹۳ (۱۶) مسدس حالی، ص ۷۱
(۱۷) مسدس حالی، ص ۸۲ (۱۸) مسدس حالی، ص ۵۸
(۱۹) کلیات حالی، ص ۴۱ (۲۰) کلیات حالی، ص ۵۱
(۲۱) کلیات حالی، ص ۳۹ (۲۲) مسدس حالی، ص ۴۷-۴۹ (۲۳) مسدس حالی، ص ۹۱-۹۳
(۲۴) مسدس حالی، ص ۲۶-۲۹ (۲۵) مسدس حالی، ص ۹۱
(۲۶) حالی کا سیاسی شعور، معین احسن جذبی، ص ۱۲۱، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی-۲۵، ۲۰۱۱ء
(۲۷) کلیات حالی، ص ۱۴۱ (۲۸) کلیات حالی، ص ۱۴۴
(۲۹) مسدس حالی، ص ۴۹ (۳۰) کلیات حالی، ص ۱۰۴
(۳۱) کلیات حالی، ص ۱۳۹ (۳۲) حالی کا سیاسی شعور، معین احسن جذبی، ص ۲۰۰، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ، نئی دہلی-۲۵، ۲۰۱۱ء (۳۳) حالی کا سیاسی شعور، ص ۱۰۰ (۳۴) مسدس حالی، ص ۴۸
(۳۵) حالی بحیثیت شاعر، ڈاکٹر سندیلوی، ص ۲۱۴
(۳۶) مسدس حالی، ص ۹۱
(۳۷) مسدس حالی، ص ۹۴

لسان القوم حضرت صفی لکھنوی

سید ضیاء الحسن
سابق استاد ادبیات فارسی واردو
امیر الدولہ اسلامیہ کالج۔لکھنؤ

علی نقی نام اور صفی تخلص ہے آپ کے والد کا اسم گرامی مولانا سید فضل حسین تھا۔آپ کا سلسلۂ نسب مذہب امامیہ کے چوتھے امام حضرت زین العابدینؒ کے فرزند سعید زید شہیدؒ سے ملتا ہے۔اس اعتبار سے آپ سادات زیدی ہیں۔آپ کا اصلی وطن غزنی ہے۔آپ کے مورث اعلیٰ سید نور الدین شاہ مبارک، التمش کے عہد حکومت (۱۲۱۱ء ۱۲۳۶ء) میں ترک وطن کر کے ہندوستان آگیے اور دہلی میں سکونت اختیار کی۔ دہلی ہی میں آپ کا انتقال ہوا اور وہیں حوض شمسی کے بالائی حصے میں آپ کی آخری آرام گاہ بنی۔سید نورالدین شاہ کے انتقال کے بعد اس خاندان کے کچھ افراد پنجاب کی سرحد پنگوڑا میں اقامت گزیں ہوئے اور کچھ لوگوں نے اودھ کے خطہ فیض آباد کو اپنا مسکن بنایا۔صفی لکھنوی کے دادا سید سلطان بن سید احسان علی ایک عرصے تک فیض آباد میں رہنے کے بعد بادشاہ نصیرالدین حیدر کے عہد (۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء) میں لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ اور یہاں اپنے دونوں بھائیوں مولانا سید حسین اور مولانا سید فضل حسین کو بھی ساتھ لائے۔ یہ دونوں بھائی عالم وفاضل اور بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔گھر کا ماحول مذہبی اور قدیم تہذیب کا نمونہ تھا۔لکھنؤ میں اس خاندان کی شرافت اور نجابت کے چرچے تھے۔صفی نے اپنے اجداد کا تذکرہ ایک نظم میں یوں کہا ہے۔

عیسیٰ بن زید حضرت شہزادہ حسین
ہیں دونوں زیدابن علی کے یہ نورعین
شہزادہ حسین کا ذوالد معہ ہے لقب
منسوب انھیں سے غزنویوں کا ہے حسب نسب
غزنی سے آے شاہ مبارک جوسوئے ہند
خاک قدم سے ان کی بڑھی آبروے ہند
دہلی میں ان کا نام ونشاں برقرار ہے
بالائے حوض شمسی ابھی تک مزار ہے
پنگوڑیوں کے وارث اعلی بڑے ولی
اولاد میں انھیں کے ہیں سید جلال بھی
شاخیں جدا جدا ہیں مگر ایک ہے چمن
اجداد کا ہمارے تھا پنگوڑ ہی وطن
جاٹوں کے تیغ ظلم سے جب خوں میں نہائے
چھوڑا وطن بزرگ ہمارے اودھ میں آئے
دل سے قریب گوکہ بظاہر بعید ہیں

ہم بھی چراغ مشہد زید الشہید ہیں

فارسی کی مشہور مثل ہے ''مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید'' یعنی مشک اپنی خوشبو سے خود پہچانا جاتا ہے نہ کہ عطار کے کہنے سے''۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی خوبیوں کی بدولت اس خاندان کی رسائی امجد علی شاہ (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء) کے دربار تک ہوگئی۔ اور مولانا سید حسین شہزادہ سلیمان قدر کی اتالیقی پر مامور ہوگئے جبکہ مولانا سید فضل حسین شہزادہ کے رفیق خاص اور معتمد قرار پائے۔

صفی کی ولادت اسی شہر تہذیب کے محلہ مولوی گنج لکھنو میں مولانا سید فضل حسین کے گھر میں ۳ جنوری ۱۸۶۲ء بروز جمعہ ہوئی۔ رسم زمانہ کے مطابق ابتدائی دینی تعلیم گھر پر ہوئی۔ بعدازاں فارسی وعربی کی تعلیم اپنے عہد کے مشہور فارسی داں مولوی نجم الدین کاکوروی اور شیخ حافظ علی بہروی سے حاصل کی۔ علاوہ ازیں اپنے خسر مولانا سید احمد علی اور اپنے چچا مولانا سید حسین سے معقولات اور منقولات میں بھی استفادہ کیا۔ اس کے بعد طب یونانی سے دلچسپی بڑھی تو حکیم سید باقر حسین کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بعدہ نائٹ اسکول میں انگریزی پڑھنا شروع کی اور ایک سال بعد لکھنؤ کے ''کیننگ کالجیٹ اسکول'' (جو بعد میں لکھنو یونیورسٹی بن گیا) میں داخل ہو کر باقاعدہ انٹرنس کی تعلیم حاصل کی....ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، مولف ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' کے مطابق ۱۸۷۹ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی جبکہ ''تنویر ادب'' کے مولف صغیر احمد جان تحریر کرتے ہیں کہ ۱۸۸۳ء میں محکمہ دیوانی میں آپ کا تقرر ہوا۔ موخرالذکر بیان کی تائید ڈاکٹر مصطفےٰ حسین فطرت بھی کرتے ہیں جنھوں نے صفی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر لکھنو یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہے۔ الغرض مختلف مقامات اور مختلف عہدوں پر سرفراز رہ کر ۱۹۲۳ء میں چالیس سالہ خدمت کے بعد پنشن پائی اور مستقل طور پر لکھنؤ میں قیام فرمایا۔

فن شاعری میں صفی نے کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا۔ پروفیسر آل احمد سرور تحریر فرماتے ہیں ''....وہ کسی استاد کے حلقہ تلامذہ میں داخل نہیں ہوئے'' (ہمارا ادب پروفیسر آل احمد سرور صفحہ ۱۷۸)

نسیم امروہوی لکھتے ہیں ''....شاعری کا ذوق فطرتاً صغرسنی ہی سے تھا۔ اس لیے آپ بارتلمذ سے سبکدوش ہیں۔'' (ضمیمہ نظم اردو۔ نسیم امروہوی صفحہ ۱۴۱)

عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی کے شاگردان رشید میں ہیں۔ ان کا اپنے بارے میں کہنا ہے:

ع اس کا شاگرد ہوں جس کا نہیں استاد کوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ پیدائشی اور فطری شاعر تھے انھوں نے سات آٹھ سال کی عمر سے ہی مصرعوں پر مصرع لگانے شروع کر دیئے تھے۔ اس عمر کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

خواب میں صورت دکھانا کیا ضرور
سوتی قسمت یوں جگانا کیا ضرور

اسی طرح بارہ سال کی عمر میں کہا ہوا ان کا یہ شعر بھی مشہور ہے۔

زہے خوش قسمتی اپنی کہاں میں اس کے قابل تھا
وہ آکر اپنے ہاتھوں سے کریں سامان مٹی کا

ایک مرتبہ آپ کے والد کے ایک دوست نے آپ سے کہا کہ ''میاں اس مصرعے پر مصرع لگاؤ

ع یہ انگشتری ہے پنھانے کے قابل

چند ہی لمحوں کے بعد صفی نے ایک مصرع کہہ کر شعر مکمل کر دیا۔ ملاحظہ ہو۔

نہیں جرم رکھتا ہمارا نگینہ
یہ انگشتری ہے پنھانے کے قابل

مذکوہ مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ موزونی طبع ان کی فطرت میں داخل تھی۔ عام حالات میں اور بول چال میں ان کے جملے مرصع و مسجع ہوتے تھے۔ یہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ صفی کو شاعری کی نعمت فطری طور پر من جانب اللہ ودیعت ہوئی تھی۔

صفی نے بجائے استاد کے استادوں کے کلام کا بھر پور مطالعہ کیا بالخصوص عروض کی کتابوں کا انھیں غیر معمولی ذوق تھا۔ علاوہ ازیں مروجہ تخیلات، قادرالکلامی، شوق، محنت اور کاوش کی بدولت شعر کہنے لگے اور وہ بھی اپنے کہے ہوئے اشعار اپنے باذوق احباب کو دے دیتے تھے جو مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھ کر داد وصولتے اور جب مشاعرے سے پلٹتے تو رپورٹ دیتے کہ انھیں کن کن اشعار پر داد ملی اور کون اشعار داد سے محروم رہے۔ اس اندازِ تبصرہ سے بھی ان کی شاعری میں نکھار پیدا ہوا۔ بالآخر وہ اپنے وقت کے اساتذہ میں شمار ہونے لگے اور بیسیوں موزوں طبع آپ کے دامن تربیت میں پرورش پا کر شاعر اور استاد بن گئے۔ ان کے شاگردان رشید میں سے چند مشہور نام یہ ہیں۔ مرزا محمد ہادی رسوا، عزیز لکھنوی، ظریف لکھنوی، جوالا پرشاد برق وغیرہ۔ علاوہ ازیں ان کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے۔

یون تو صفی کو ان کی شاعرانہ عظمت، ادبی و قومی خدمات کے صلے میں کئی بار اعزازات و خطابات سے نوازا گیا لیکن ''لسان القوم'' کا خطاب انھیں ۲۱/اپریل ۱۹۱۶ء کو جون پور کے ایک اہم ادبی اجلاس میں پیش کیا گیا اور یہ خطاب اتنا مشہور رہوا کہ تقریباً ان کے نام کا جز بن گیا۔

صفی لکھنوی بھی حالی، شبلی اور اکبر کی طرح قوم و ملت کی تباہی و بربادی سے متاثر ہیں۔ ان کی شاعری میں اتحاد ملت کی تمنا بھی ہے اور ملک و قوم کی فکر بھی۔ وہ تعلیم کو مسلمانوں کی ترقی کے لیے بہت اہم تصور کرتے ہیں اور ان سے یوں مخاطب ہیں:

اے جوانان ملت، اے بہی خو اہان قوم
جانگذا ہے درد، مل کر کیجئے درمان قوم
چاہتے ہیں آپ اگر گھٹنے نہ پائے شان قوم
دیجئے تعلیم اسے تعلیم ہی ہے جان قوم
جلد سامان حیات جاودانی کیجئے
تازہ رس پھولوں کی اپنے باغبانی کیجئے

انھیں اس کا شدید غم ہے کہ تعلیم سے دوری اور صنعت و حرفت سے بے تعلقی نے ہمیں کتنا بیک ورڈ بنا دیا ہے۔ ہم پہلے کیا تھے اور اب کیا ہو گئے۔ افسوس کہ:

ہر صنعت و حرفت سے ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے
ہر علم سے حکمت سے ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے
اسباب معیشت سے ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے
احکام شریعت سے ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے
ہے گرم فقط ہم سے اب محفل رندانہ

ان کا دل مسلمانوں کی بے حسی اور آرام طلبی سے کڑھتا ہے انھیں بھی اقبال کی طرح جوانوں کی تن آسانی لہو

رلاتی ہے۔ وہ نوجوانانِ ملت کو جھنجھوڑتے ہوئے انھیں ان کے شاندار ماضی کا آئینہ دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سوچو پہلے تم کیا تھے اور اب کیا ہو؟

اک ذرا اقوام کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے
قوت تنقید کی عینک لگا کر دیکھئے
نقش دھندلے ہوں تو ہاں نظریں جما کر دیکھئے
واقعات حال و ماضی سب ملا کر دیکھئے
آنے والے واقعے روشن نظر آئیں گے سب
دل کے آئینے میں عکس ان کے نظر آئیں گے سب

صفی اپنے ملک کے حالات سے بے خبر نہیں ہیں وہ ملک میں ہونے والے آئے دن کے فرقہ وارانہ فسادات پر خون کے آنسو روتے ہیں۔ ان کی تمنا ہے کہ ہندو مسلم اس ملک کے باشندے ہیں۔ وہ یہاں مل جل کر یوں رہیں جیسے ''ہم'' کا ''ہ اور م''۔ ان کا انداز دیکھئے:

لفظ ''ہم'' میں جس طرح ''ہ م'' ہیں شیر و شکر
چاہئے ہندو مسلماں یوں ہی مل جل کر رہیں
قابل افسوس ہیں وہ فرقہ وارانہ فساد
ملک میں جس سے لہو کی ندیاں ہر سو بہیں

لکھنؤ کی شاعری اپنے مزاج کے اعتبار سے اس عہد میں خارجیت کی زندہ مثال تھی بلکہ ظاہری حسن اور ظاہری رکھ رکھاؤ کی وجہ سے بدنام، رعایت لفظی، مبالغہ آرائی، ضلع جگت اور ابتذال کی یہاں کی شاعری میں بھرمار تھی۔ صفی کو یہ کیفیت بالکل ناپسند تھی۔ انہوں نے عملاً لکھنؤ کی شاعری کے دامن کو بدنامی کے اس دھبے سے پاک کیا۔ خود بھی ان باتوں سے احتراز کیا جو لکھنوی شاعری کی رسوائی کا سبب تھیں۔ اور اپنے شاگردان رشید کو بھی ان حماقت آفریں غلطیوں سے بچنے کی تاکید کی۔ چنانچہ ان کے کلام میں نہ تو مبالغہ کا عیب ہے اور نہ رعایتِ لفظی کی بھرمار۔ ضلع جگت اور ابتذال سے آپ کا کلام بالکل پاک ہے۔ سادگی آپ کی غزلیات کا خاص جوہر ہے۔ زبان اور طرز بیان دونوں میں سادگی، صفائی اور دلکشی ہے۔ عاشقانہ مضامین کو نہایت موثر طریقے پر نظم کر جاتے ہیں۔ محاورات، روزمرہ اور تشبیہات کا لطف بھی ہر جگہ برقرار رہتا ہے۔ فلسفۂ زندگی پر بھی آپ نہایت خوبی سے روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے کلام میں مغربی مذاق کی بھی چاشنی ہے۔ اس کے سبب سے خیالات میں تنوع بھی ہے اور ندرت بھی۔ صفی عصر حاضر کے مسائل بھی اپنی غزل میں اس طرح سمو دیتے ہیں کہ وہ غزل کی روایت کا جز بن جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں صفی کے کلام کی پختگی، کہنہ مشقی اور استادی پر دلالت کرتی ہیں۔ ان حقائق کو ذہن میں رکھ کر اگر یہ کہا جائے کہ صفی نے لکھنؤ اسکول کی شاعری کے دامن کو بدنامی کے دھبے سے پاک کیا تو بالکل صحیح ہے۔

صفی نے نظمیں بھی کہی ہیں لیکن درحقیقت ان کی شہرت کا دارومدار زیادہ تر ان کی وہ قومی نظمیں ہیں جو مناظر سے متعلق ہیں۔ اس طرح وہ بھی اپنے ہم عصر طباطبائی کی طرح جدید و قدیم کے عبوری دور میں ہیں کہ ان کی نظمیں دونوں دور میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی کچھ نظمیں تاریخی اور جغرافیائی مضامین پر بھی ہیں اور باوجود اپنے خشک موضوع کے دلکش اور پرلطف ہیں۔ ان نظموں میں الفاظ کے ذریعے سے جو تصویریں تیار کی گئی ہیں وہ ہر لحاظ سے داد کے قابل ہیں۔ اس کے علاوہ ان نظموں کے ذریعے انہوں نے ملک کی تباہی اور

اہل وطن کی بربادی کے دردناک بیان سے اہلِ وطن کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان نظموں میں پرجوش سادگی اور دلکشی بھی موجود ہے۔ اور رنگ تغزل بھی۔

غزل میں عاشقانہ مضامین ان کا خاص موضوع ہیں جن کو درد اور یاس سے ترتیب دے کر وہ شعر کا جامہ پہناتے ہیں زبان سادہ اور بیان میں فطری صفائی ملتی ہے۔ زبان وہی ہے جو لکھنؤ کی کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی زبان ہے۔ اس لیے ظاہری صورت کے اعتبار سے ان کا کلام ان کی مشاقی اور استادی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ ان کے کلام کا اندازہ ان کی مندرجہ ذیل غزل سے کیا جاسکتا ہے۔

تو بھی مایوس تمنا مرے انداز میں ہے
جب تو یہ درد پپیہے تری آواز میں ہے
شوخی حسن حسینوں کے ہر انداز میں ہے
کبھی چتون میں کبھی پردۂ آواز میں ہے
نواسیران چمن کے کوئی دل سے پوچھے
وہ مصیبت جو شکست پر پرواز میں ہے
اف ری ناسازی دل گو کہ زمانہ گذرا
ضعف اب تک وہی ڈوبی ہوئی آواز میں ہے
اسے خاموش ہی رہنے دو صفی کیوں چھیڑو
اثرِ سوزِ تپ غم دلِ ناساز میں ہے

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غزل میں قدیم رنگ تغزل ان کو پسند ہے اور لکھنؤ کی اس عہد کی شاعری انہیں ناپسند۔ البتہ مضمون میں جدت یا بلند خیالی میں اگر کہیں کمی آجاتی ہے تو زبان و بیان سے اس کی تلافی کر دیتے ہیں۔ کہیں کہیں معرفت کے اشعار بھی ان کے کلام میں نظر آتے ہیں۔

جمال معنی کی معرفت سے ہنوز دل بہرہ ور نہیں ہے
بنادے کعبہ جو بتکدے کو ابھی وہ ذوق نظر نہیں ہے
بنائے ہستی ہے نیستی پر مگر تمہیں کچھ خبر نہیں ہے
یہ گلشن رنگ و بو ہے کیا شئے اگر فریب نظر نہیں ہے
ہے کہنہ مہماں سرائے ہستی مسافران عدم کی بستی
ہزار چاہیں کہ جم کے بیٹھیں اجازت اس کی مگر نہیں ہے

صفی لکھنوی لکھنؤ کے مشہور و معروف مزاح نگار شاعر جناب مقبول حسین ظریف لکھنوی کے برادر اکبر تھے۔ ظریف صحیح معنوں میں صفی لکھنوی کے ہی تربیت یافتہ تھے۔ شاید اسی لیے صفی کے کلام میں کہیں کہیں مزاح کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔

آپ کے کلام معجز بیان سے چند ایسے اشعار ملاحظہ فرمائیں جو بہت زیادہ مشہور ہیں۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا
اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی وہ ابھرے گا جتنا کہ دباویں گے
جنازہ روک کر میرا وہ اس انداز سے بولے
گلی ہم نے کہی تھی تم تو دنیا چھوڑے جاتے ہو
دل کے اجزائے پریشاں کو حقارت سے نہ دیکھو
کہیں صدیوں میں یہ سرمایہ بہم ہوتا ہے
دیر اسی کو جانئے کعبہ اسی کو مانئے
پوجئے وہ دل جسے ہمدرد انساں دیکھئے

بلبلیں شور مچائیں نہ چمن میں کہہ دو
بستر گل پہ کوئی خواب گہہ ناز میں ہے

صفی کی مسلسل نظموں میں سب سے طویل اور مشہور نظم ''تنظیم الحیات'' ہے جو ایک انگریزی کتاب (Economy of Human Life) کا منظوم ترجمہ ہے اس نظم میں تین ہزار اشعار ہیں اور ۴۹ ابواب جس میں حمد، نعت، منقبت، سبب اور ماخذ سے متعلق اشعار شامل ہیں۔ نیز اس کتاب پر ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی طرف سے انہیں انعام بھی ملا تھا۔ چونکہ یہ کتاب اخلاق سے متعلق ہے اس لیے یہ ''کنز الاخلاق'' کے نام سے بھی مشہور ہے۔ مذکورہ کتاب میں ''تتلی'' کے عنوان سے ایک نظم ہے جس کی زبان ملاحظہ ہو کتنی صاف، سادہ اور پر اثر ہے۔

تتلی اے جامہ زیب تتلی
خوش رنگ نظر فریب تتلی
ننھی سی جان پیاری تتلی
نیلی پیلی سفید چتلی تتلی
تو حور جناں کی پنکھیا ہے
یا پھول ہے، پنکھڑی ہے کیا ہے
نازک نازک ترے یہ بازو
یا شوخی حسن کے ترازو
اڑتی پھرتی ہے باغ بھر میں
چپہ چپہ تری نظر میں
رمنہ ترا ہے سبزۂ وگل
قبضہ میں ترے ہے جزو تاکل
قدرت کی یہ فیض گستری ہے
کیڑا جو تھا وہی اب پری ہے

صفی نے ہندوستان کے کئی شہروں پر نظمیں لکھی ہیں جن میں عروس البلاد بمبئی اور الہ آباد پر ان کی نظمیں خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان نظموں میں ہندوستان کی عظمت، حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبات نمایاں ہیں اور نئے رجحانات اور میلانات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

مناظر فطرت سے متعلق ان کی نظم ''تاروں بھری رات'' کے بھی چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور رات کے سماں سے لطف اندوز ہو جئے۔

نظر کے سامنے ہے اک طلسمات
تری کیا بات ہے اے تاروں بھری رات
ستارے ہیں کہ نازک آبگینے
رواں یا بحر اخضر میں سفینے
یہ انجم یہ فضائے چرخ اخضر
سمندر میں بطیں جیسے شناور
ستارے جن کے ہر سو غلغلے ہیں
یہ سب بحر فنا کے بلبلے ہیں
جو ان کی گردشوں پر کیجئے غور
ہر اک کا ان میں سے محدود ہے دور
لبوں پر ہے تحیر کا ترانا
کسی کا ہے یہ دہر آئینہ خانہ
خدا جانے سر منزل کہاں ہے
رواں دن رات یونہی کارواں ہے
نہ جانے توڑ کر اک سلک گوہر

کیے کس نے ہیں یہ موتی نچھاور

مذکورہ نظم طویل ہے اور طوالت سے بچنے کے لیے یہاں اختصار سے کام لینا پڑ رہا ہے۔

صفی نے مشہور نقاد اور شاعر خواجہ الطاف حسین حالی کے انتقال پر جو مرثیہ قلم بند کیا ہے وہ بھی قابل تعریف اور اردو ادب میں ایک خاص مقام کا حامل ہے۔ تین بند اس مرثیہ کے بھی ملاحظہ ہوں۔

اس بزم میں آکے جانے والا
پھر جا کے ادھر نہ آنے والا
کھوٹوں کو کھری سنانے والا
اے قوم ! ترا جگانے والا
خاموش لحد میں سو رہا ہے
اور اس کو زمانہ رو رہا ہے
وہ خضر ادب، ادیب مشتاق
فرخندہ سیر، طبیب اخلاق
یکتائے زماں ، وحید آفاق
گر نظم میں فرد، نثر میں طاق
پاکیزہ خیال، پاک طینت
جس بزم میں ہو وہاں کی زینت
دل خون کیا جب اس خبر نے
آنسو برسائے چشم تر نے
دل سے درخواست کی جگر نے
لکھی یہ صفی نوحہ گر نے
تاریخ وفات خواجہ حالی
ہستیٔ حالی سے اب ہے خالی

۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴

صفی کا ۱۹۵۰ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ اور لکھنؤ ہی میں مدفون ہوئے۔

''سلیمان خطیب'' دکنی زبان کا نمائندہ شاعر

ڈاکٹر محمد انظر ندوی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ مطالعاتِ عربی،
انگلش اینڈ فارن لینگویجز یونیورسٹی، حیدرآباد۔ 007 500، تلنگانہ۔

اپنے فکر وفن کو قدیم دکنی زبان کا پیرہن عطا کرنے والے سلیمان خطیب محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ دکنی زبان کو ایک نئی زندگی بخشنے اور اس کے فروغ کی راہیں ہموار کرنے کے سلسلے میں وہ ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے۔ انہوں نے نہ صرف شعروادب کی محفلیں جمائیں بلکہ اپنی تخلیقات سے اپنی انفرادیت کا سکہ بھی جمایا۔ انہوں نے طنز ومزاح اور ظرافت سے بھرپور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے ذریعے میدانِ مزاح نگاری میں اپنی ایک علاحدہ شناخت بنائی۔ زبان کی ندرت، دل کو چھو لینے والا انوکھا اندازِ بیان اور نظموں کی ڈرامائیت کی وجہ سے انہوں نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی۔ انہوں نے کم وبیش ربع صدی تک ممبئی، دہلی، پٹنہ اور کشمیر سمیت ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے مشاعروں میں بے تاج بادشاہ بن کر راج کیا، بلکہ ان کے تعلق سے یہاں تک نقل کیا جاتا ہے کہ ''ہندوستان کا کوئی مشاعرہ ان کی شرکت کے بعد کامیابی سے بچ نہیں سکتا''۔ وہ مشاعرہ کو لوٹ لینے پر اس طرح اپنی خوشی کا اظہار کرتے گویا کوئی علاقہ فتح کرلیا ہو، ان کی زندگی کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مشاعرہ کے لیے انہوں نے خود کو وقف کر رکھا تھا۔ مشاعرہ میں شرکت کی دعوت پر بہر صورت شریک ہونے کی کوشش کرتے تھے۔

'کرناٹک کی ادبی شخصیات' کے مصنف محمد خورشید عالم ندوی نے وہاب عندلیب صاحب کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۱۹۶۰ء کی دہائی سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا جس کے بعد ان کے اقبال کا سورج چڑھتا ہی رہا، کبھی اس کو زوال نہیں آیا۔ اس مدت میں انھوں نے نثری وشعری تخلیقات کا گراں بہا سرمایہ اردو دنیا کو دیا۔ شعری تخلیقات میں ان کی نظموں کو مختلف مرکزی عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً سماجی اصلاح کے تحت پہلی تاریخ، چھورا چھوری، ساس بہو، اٹھائیس تاریخ، ہراج کا پلنگ، بیچارگی۔ مناظرِ فطرت کے ضمن میں پگڈنڈی، ندی، موت کا پانی، پانی دے رے میگھ راج، نہیو کالا۔ حب الوطنی کے موضوع پر ہمالہ کی چاندی، چینی گڑیا، بہادر بیٹا، ایسا سمئے اب آئے گا، وغیرہ نظمیں لکھی ہیں۔ جبکہ سیاست اور سیاست کے گلیاروں کو موضوع بناتے ہوئے الیکشن کا موسم، چمچے، کانا دجال، آخری تمنا اور سفیرِ امن کے عنوان پر نظمیں کہی ہیں۔ انھوں نے رومانیت کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا اور عشق ومحبت کے موضوع پر پڑوسن، دکنی عورت کا انتظار، سن رے گوی، یاد، محبوب صاحب محمود بی کے عنوان سے رومانیت کو پیش کیا ہے۔ ان نظموں میں جہاں حقیقت بیانی سے کام لیا گیا ہے، وہیں طنز وظرافت کے ساتھ ساتھ نقد کا نشتر بھی چبھویا

ہے۔ جملہ طور پر ان کی نظموں میں ساس بہو، پہلی تاریخ، سانپ، روٹی، رستے، تلاشِ گمشدہ، اٹھائیس تاریخ، ہراج کا پلنگ اور الیکشن کا موسم، وغیرہ سماجی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ عوام وخواص میں یہ نظمیں بے حد مقبول ہیں۔

سلیمان خطیب ۲۶/ دسمبر ۱۹۲۲ء میں سابق ریاستِ حیدرآباد کے ضلع گلبرگہ، بیدر کے مقام چٹگوپہ، تعلقہ ہمنا آباد (کرناٹک) میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد عہدِ عالمگیری میں جامع مسجد چٹگوپہ کے خطیب رہے، خطیب ان کا خاندانی نام ہے جسے انہوں نے اپنا تخلص قرار دیا۔ والد کا نام محمد صادق خطیب تھا۔ والدین کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد بڑے بھائی وزیرالدین کی خاص توجہ سے رائچور میں اسکول کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ہائی اسکول کی تعلیم میدک میں محمد حسین ادیب اور مولانا عبدالرحیم صدیقی حیرت کے زیرِ تربیت رہ کر حاصل کی۔ حیدرآباد سے میٹرک کی سند لی اور منشی فاضل کی سند ان کی صاحبزادی ڈاکٹر شمیم ثریا کے بقول پنجاب سے اور کرناٹک کی ادبی شخصیات کے مصنف کی تحقیق کے مطابق جامعہ نظامیہ حیدرآباد سے حاصل کی۔ ملازمت پیشہ کیریئر کا آغاز ۱۹۴۱ء میں میکانیکل فورمین محکمہ واٹر ورکس گلبرگہ سے کیا اور دسمبر ۱۹۷۷ء تک فلٹر بیڈس کی خدمات پر مامور رہے اور اسی سال وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ یہاں واقع ان کی رہائش گاہ ''پانی محل'' کے نام سے مشہور تھا۔ سلیمان خطیب ۱۹۴۶ء میں رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئے۔ دس اولاد ہوئیں جن میں پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں تھیں۔ سلیمان خطیب ۲۲/ اکتوبر ۱۹۷۸ کو اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد شعرا اور ادبا نے اپنے حزن وملال کے اظہار اور خراجِ عقیدت کے طور پر مرثیے اور قطعاتِ تاریخِ وفات کے نذرانے پیش کیے۔ ان کے مزاحیہ کلام کا آڈیو کیسٹ تیار ہوا۔ کرناٹک اردو اکیڈمی نے ان کے شعری مجموعۂ کلام 'کیوڑے کا بن'' کا منظوم ترجمہ کروا کر شائع کیا۔ ان کا کلام پھر اردو سے کنڑ میں منتقل کیا گیا۔ مرحوم کی صاحبزادی ڈاکٹر شمیم ثریا نے اپنے والد کی حیات وخدمات پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ مختلف مقامات سے کئی جرائد ورسائل نے ان کی یاد میں خصوصی شمارے شائع کیے۔ نیز ان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے ۱۹۸۹ء میں ان کے نام سے تعلیمی وثقافتی امدادی ٹرسٹ بھی قائم کیا گیا۔ ستمبر ۲۰۱۳ء میں اردو اکیڈمی نے جناب وہاب عندلیب کی مرتب کردہ کتاب ''سلیمان خطیب شخص، شاعر اور نثر نگار'' شائع کی۔ سلیمان خطیب دکنی اردو کے بے مثال شاعر ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں حکومتِ کرناٹک نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں راجیوتسوا اسٹیٹ ایوارڈ سے نوازا۔ ۱۹۷۵ء میں انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام اعلیٰ پیمانے پر جشنِ خطیب کا اہتمام کیا۔ اسی موقعہ پر ان کا مجموعۂ کلام ''کیوڑے کا بن'' زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ سلیمان خطیب نے ساؤتھ انڈیا اردو اکادمی گلبرگہ کی داغ بیل ڈالی۔ علاوہ ازیں کرناٹک ہندی، پرچار سبھا (گلبرگہ) کے نائب صدر اور مراٹھی ساہتیہ منڈل گلبرگہ کے رکن کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات لائقِ ستائش ہیں۔

دکنی زبان: اہمیت اور تاریخ

دکنی زبان کی ایک تاریخ ہے۔ دکن میں یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس زبان میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یہاں کے بزرگانِ دین نے اسی زبان میں دینِ حنیف کی نشر و اشاعت کی اور اپنی تعلیمات عام کیں۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیفات نے دکنی ادب میں وقیع اضافہ کیا ہے

۔انہوں نے معراج العاشقین کے نام سے تصوف کے موضوع پر ایک رسالہ تحریر کیا تھا، جو نہایت عام فہم اور عوامی مزاج کے مطابق تھا اور یہ اردو میں دکنی نثر کا پہلا نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ تبلیغ واشاعت کا کام وہاں کی عوامی زبان میں انجام دیے، لہذا میران جی شمس العشاق، برہان الدین جانم وغیرہ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ان بزرگان نے اس عوامی زبان جسے ہندی یا ہندوی کہتے تھے، کو وسیلۂ اظہارِ خیال بنا کو نظم ونثر میں صوفیانہ باتیں اور مذہبی نکات بیان کیے ہیں۔

بزرگوں اور صوفیا کے بعد مختلف ادوار میں اس زبان کو بہمنی سلطنت، عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین کی سرپرستانہ توجہ حاصل رہی۔ان درباروں سے جڑے ادبا وشعرا نے اس کی خوب آبیاری کی۔دکنی ادب کے ابتدائی زمانے ہی میں دکن کے مشہور شاعر مُلّا وجہی نے نثر میں 'تاج الحقائق' پھر 'سب رس' لکھ کر دکنی ادب کو نثر کا شاہکار شہ پارہ دیا۔سب رس اخلاقی اور صوفیانہ رنگ کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔زبان صاف ستھری اور خالص دکنی لب ولہجہ میں ہے۔سب رس کی تصنیف کا زمانہ 1635 ہے۔اسی طرح دکن کی پہلی طبع زاد مثنوی قُطب مشتری ہے۔

شعروسخن کا بڑا ذخیرہ اس زبان میں ملتا ہے۔نصرتی، نشاطی، ولی، باقر آگاہ اور قلی قطب شاہ وغیرہ نے دکنی زبان میں اردو شاعری کی ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور اردو ادب کو اپنے جواہر پاروں سے مالا مال کیا ہے۔پروفیسر یوسف رحمت زئی اپنے مضمون ''شاعری سچ بولتی ہے'' میں لکھتے ہیں:'' دکنی زبان ایک سیدھی سادی زبان ہے، اس میں مٹھاس ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں تصنع نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔اس زبان میں لفظوں کی آسان ترین ادائیگی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، اگر کوئی مشکل ہو تو دکن والے اس کے تلفظ کو بدل کر آسان کر لیتے ہیں، گویا لفظ دکنیا لیا جاتا ہے۔دکن کے تلفظ میں الفاظ پھسل کر ادا ہوتے ہیں اور ایک نامحسوس طریقے سے ایک مصوتے سے دوسرے مصوتے تک ادائیگی منتقل ہوتی ہے، جیسے ''بولا'' کے لیے دکنی میں ''بولیا'' کہا جاتا ہے، لیکن اگر ''بولیا'' کہا جائے تو یہ دکنی کا قتل ہے''۔ پروفیسر یوسف رحمت زئی کے بقول صحیح دکنی تلفظ کے ساتھ لفظ ادا کرنے کے لیے صرف دکنی ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ دکن میں رہتے ہوئے دکن کا مزاج رکھنا اور اس مزاج سے ہم آہنگ ہونا بھی ضروری ہے، اگر یہ دونوں باتیں کسی محقق یا ادیب یا شاعر کی زبان میں بدرجۂ اتم پائی جائیں تو اس کی زبان میں شمالی ہند کی طرح شستگی بھی ہوگی اور اس میں دکن کا لہجہ بھی پوری طرح دکھائی دے گا۔ پروفیسر یوسف رحمت زئی مزید کہتے ہیں کہ سچ بات یہ ہے کہ دکنی میں مراٹھی کی لچک، تلگو کی چھنک اور کنڑی کی لٹک موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ دکنی ہندوستان کی تمام زبانوں اور بولیوں سے مختلف ہے۔دکنی شاعری کو صرف مزاح کی چیز سمجھنا غلط ہے، اس زبان کے لوچ اور نزاکت سے واقفیت قاری کو شاعری کی روح تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے، چنانچہ جو لوگ اس زبان کے لوچ سے واقف نہیں اور اس کی نزاکتوں سے آگاہ نہیں ہیں وہ جب دکنی زبان سنتے ہیں تو فصیح اور غیر فصیح، متروک اور غیر متروک کے چکر میں پڑ کر شاعری کی روح تک پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں۔

پروفیسر مجید بیدار اپنے ایک مضمون بعنوان '' سلیمان خطیب کی شاعری میں المیہ اور طربیہ پیکر کی حسن آفرینی '' میں دکنی زبان کے نشیب وفراز پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:'' اردو کی ادبی زبان سے قبل دکنی لب ولہجہ کو بیشتر شعرا نے

لچری زبان اور غیر معیاری زبان کی حیثیت سے متعارف کرایا۔لیکن بہمنی دور سے لے کر مغلوں کی دکن میں آمد تک جس زبان نے اپنے وقار کو برقرار رکھا، اور سولہویں صدی کے اواخر میں دم توڑ کر پھر بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں ارتقائی مراحل طے کیے۔اس زبان کو دکنی زبان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔جسے مغلوں نے دکن کی فتح کے بعد یکسر معدوم کر دیا، لیکن بیسویں صدی کے نصفِ اوّل کے ساتھ ہی اس زبان کو دوبارہ معیار کا درجہ حاصل ہوا۔دکنی شاعری کو عصرِ حاضر میں بہ یک وقت المیہ اور طربیہ محاکاتی خصوصیات اور پیکروں سے وابستہ کرنے والے اہم شاعر کی حیثیت سے سلیمان خطیب کا نام ہمیشہ سربلند رہے گا۔جنھوں نے دکن کے بہمنی دور کے دارالسلطنت گلبرگہ میں اپنی زندگی گذارتے ہوئے مختلف نثری اصناف کی نمائندگی کی اور آخر میں دکنی شاعری کی طرف توجہ دی۔انھوں نے کیفیاتی فضا کو دکنی شعر میں سمونے اور اشعار کی دلکشی کو برقرار رکھنے کے ہنر کا مظاہرہ کیا۔دکنی لب ولہجہ کے ساتھ منفرد منظر نگاری کی بنیاد رکھی۔جسے بلاشبہ المیہ اور طربیہ پیکر تراشی کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔''

دکنی زبان اور سلیمان خطیب

سلیمان خطیب دکنی روش، دکنی لب ولہجہ کی فراوانی اور جدید دکنی زبان کے ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے بے حد مقبول ہیں اور انہوں نے اپنے کلام سے ایک زمانے کو متاثر کیا۔ان کی شاعری میں کنڑی اور تلگو کے علاوہ مرہٹی زبان کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔دکنی شاعری اور خصوصاً مزاحیہ دکنی شاعری کے حوالے سے سلیمان خطیب کا نام جلی حرفوں میں کندہ ہے۔ان کا لب ولہجہ جہاں منفرد تھا، وہیں ان کا انداز بھی نرالا تھا، انہوں نے قلی قطب شاہ، ملا وجہی، نصرتی، ملک خوشنود اور ابن نشاطی وغیرہ کی زبان کو اپنا میڈیم بنایا اور نذیر دہقانی، علی صاحب میاں اور سرور ڈنڈا کی اتباع میں اپنی قہقہہ بردوش شاعری کو زندہ کر دیا۔انہیں یہ کمال حاصل ہے کہ انہوں نے الفاظ اور محاورے ایسے استعمال کیے جو بالکل مقامی رنگ لیے ہوئے ہوتے تھے، لیکن موضوعات اتنے سنجیدہ ہوتے تھے کہ لوگ ان کی تخلیقات کی سحر آفرینی سے بے پناہ متاثر ہوتے تھے۔

سلیمان خطیب کا خمیر دکنی ہے، ان کا مزاج دکنی ہے، ان کا لہجہ اور ان کا اسلوب دکن کی نزاکتوں سے سجا ہوا ہے، انہوں نے جہاں زندگی بسر کی وہ دکن کا حصہ رہا ہے اور اسے مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔حسن شاہ گنگو بہمنی نے جب اپنی سلطنت قائم کی تو گلبرگہ کو دارالسلطنت بنایا، حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا تعلق یہیں سے تھا اور یہیں وہ سکونت پذیر رہے، چنانچہ سلیمان خطیب میں یہاں کا ماحول، آب وہوا، زبان، لب و لہجہ رچ بس کر جزو ذات بن گیا تھا، ان کی ہر ادا میں دکن کی نفاست جھلکتی تھی، یہی وجہ ہے کہ انہیں دکنی زبان پر فطری طور سے عبور حاصل تھا اور اس پر انہیں ناز بھی تھا، وہ فصیح اردو بھی جانتے تھے، لیکن تقریر یا تحریر میں دکنی زبان کے استعمال کو ترجیح دی۔

سلیمان خطیب اپنے شعری مجموعہ ''کیوڑے کا بن'' میں رقمطراز ہیں: ''میرا ماحول دکنی تھا، اس لیے میں نے دکنی زبان اپنائی، میری شاعری کا مزاج بھی دکنی ہے، اس کی تشبیہات دکنی ہیں، روزمرہ کے محاورے دکنی ہیں، رسم ورواج دکنی ہیں، زبان کا بانکپن بھی دکنی ہے، میں نے ساکن لفظ کو دکنی کے انداز میں بھی متحرک باندھا، قوافی سے بغاوت کی ہے، یا صوتی اعتبار سے الفاظ استعمال کیے ہیں''۔اسی طرح ملنسار اطہر

کے نام ایک مکتوب (مورخہ ۱۹/ ۹/ ۱۹۷۸ء) میں اپنی انکساری کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے: ''میں دکنی زبان کا شاعر ہوں اور عوامی شاعر ہوں، میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ عوام کے لیے لکھا ہے....'' آگے تحریر فرماتے ہیں ''میرا اندازِ بیان بالکل سیدھا سادا دکنی ہے، سہلِ ممتنع کے قریب قریب، جس میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، مزاج کی چاشنی ہے، مجھے جدید اور قدیم ادب کی ترازو میں مت تولو۔ کسانوں کی، مزدوروں کی اور عوام کی صف میں شامل رکھو اور ان کا شاعر لکھو، یہی بس ہے''۔

ڈاکٹر عابد علی خان مرحوم نے خطیب کے مجموعۂ کلام ''کیوڑے کا بن'' کے پیشِ لفظ میں لکھا تھا کہ ''خطیب کی مقبولیت کی بڑی اور بنیادی وجہ دکھنی زبان کا استعمال اور اس میں عوامی مسائل کا اظہار ہے، وہ عوام کے مسائل کے ترجمان شاعر ہیں اور روزمرہ زبان میں عوام سے مخاطبت عوام پر گہرا اثر چھوڑتی ہے''۔ مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سلیمان خطیب کا رشتہ راست عوام سے تھا، ان کی شاعری عوام کے لیے تھی، انہیں خواص سے کوئی مطلب نہیں، یہ اور بات ہے کہ خواص بھی اس عوامی شاعری سے اسی طرح لطف اندوز ہوتے ہیں جس طرح عوام۔ میر نے کہا تھا کہ ؎

گو میرے شعر ہیں خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

سلیمان خطیب کو ابتدا ہی سے دکنی لوک گیتوں سے شغف رہا، انہیں دکن کے گاؤں گاؤں پھرنے کا موقعہ ملا اور انہوں نے اپنی محنت و لگن سے دکنی محاورے، تشبیہات اور ہزاروں لوک گیت جمع کیے، جن کا انہوں نے اپنی شاعری میں بر محل استعمال کیا، انہیں دکنی محاورے اور تشبیہات کے استعمال میں کمال حاصل تھا، ان کی شاعری کا بنیادی وصف لوک گیتوں کا انداز ہے، دیہات کی عورتیں جس بولی میں گفتگو کرتی ہیں اور دیہات کے بھولے بھالے، سیدھے سادے کسان جس بولی میں بات کرتے ہیں وہی بولی، وہی تلفظ اور وہی انداز سلیمان خطیب کا ہے۔ خطیب کی شہرت کا راز یہ ہے کہ خطیب نے قدیم دکنی محاورات، تشبیہات اور استعاروں کو نہایت چابکدستی سے استعمال کیا۔ پروفیسر رؤف خوشتر اپنے مضمون میں رقم کرتے ہیں کہ ''محمد قلی قطب شاہ معانی اور نظیر اکبرآبادی کے بعد اردو شاعری میں ہندوستان کے دیہات کے باشندے اپنے رسموں، رواجوں، تیوہاروں، پستیوں اور بلندیوں کے ساتھ خطیب کی شاعری میں زندہ ہوا ٹھے۔ یہ دوسرے تمام معاصرینِ دکن (علی صاحب میاں، نذیر دہقانی، اعجاز کٹھا، سرور ڈنڈا، حمایت علی حمایت) میں منفرد و محترم ہیں''۔ ہر ملازم کے لیے پہلی تاریخ بڑی اہم ہوتی ہے۔ اس دن پچھلے مہینے کی ساری کمائی یکمشت ملتی ہے اور اس پر آنے والے مہینے کا دارومدار ہوتا ہے، ایک کم معاش ملازم کے لیے تو اور بھی مشکل ہوتی ہے کہ اس نے مہینہ بھر قرض لے کر دن گزارے تھے اور ہر ایک سے پہلی کا وعدہ کیا تھا، سلیمان خطیب کی شاعری میں ایک ایسے ہی ملازم کی خوشیاں دیکھیے جو اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

تجھے معلوم ہے، کی انا خوشی سے آیوں
منجے آتے سو بی، نیں آتے سو گانے گایوں
ادی بریانی بی ہوٹل میں دبا کو کھایوں
دیکھ جبیق میں ترے واسطے کیا کیا لایوں
آج تنخواہ ہے مری، آج ہے چاندی سونا
بول گلے میں ترے واسطے کیا کیا ہونا

مگر بیوی کے ذہن میں سیٹھ کا خیال مسلط ہے، کہتی ہے ۔

کی شرم نئیں سوکتیں ، بات کو تنخواہ آریئے
آنے کی دیر بی نئیں سیٹھ کے گھر یو جاریئے

سلیمان خطیب اور سماجی مسائل

سلیمان خطیب عوامی شاعر تھے، ان کی شاعری میں عوامی لہجہ اور عوامی جذبات نظر آتے ہیں ، انہوں نے عوامی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، انہوں نے اپنی ایک نظم ''ایک کلرک کی بیوہ'' میں کلرک کا مہینے کی آخری تاریخوں میں انتقال کر جانا اور اس بیوہ کا شوہر کی قبر پر آہ وزاری کرنا، ان احساسات کا اظہار خطیب کے ان اشعار میں دیکھیے ۔

ایسا مرنا بھی کینکا مرنا جی
پھول تک میں ادھار لائی ہوں
اتّا احسان مجھ پو کرنا تھا
تنخواہ لینے کے بعد مرنا تھا

موجودہ سماجی مسائل پر سلیمان خطیب نے اظہارِ خیال کیا ہے، ان کی ایک نظم ''سانپ'' ہے، اس نظم کی ابتدا میں انہوں نے لڑکے کے تعارف میں ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے کہ سننے والے کے سامنے معاشرہ کی مکروہ تصویریں رقص کرتی نظر آتی ہیں، لیکن ان کا بھرپور وار نظم کے آخری حصہ ہی میں ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے ناصحانہ انداز میں لڑکی کے والدین کو لڑکی کے رشتے کے تعلق سے کافی غور وفکر کے بعد قدم اٹھانے کی تلقین کی ہے، ذیل کے چند اشعار ملاحظہ کریں جن سے ان کی فکر کی ترجمانی ہوتی ہے ۔

خوب سوچ سمجھ کے بچی دو
کاٹ کھانے کو سانپ آتے ہیں
روپ بھر کر کبھی فرشتوں کا
گھر بسانے کو سانپ آتے ہیں
ہم نے ممبر پہ سانپ دیکھے ہیں
ہم نے مندر کے سانپ دیکھے ہیں
کیا بتائیں کہ اونچی کرسی پر
کتّے زہریلے سانپ دیکھے ہیں
رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوتا
خوب سوچ سمجھ کے بیٹی دو

آج کے معاشرے میں لڑکوں کے سرپرستوں کے لڑکی کے سرپرستوں سے مطالبات، ان پر اصرار اور خود کی جوابی فرمائشوں سے مجبوری کا اظہار سلیمان خطیب نے یوں کیا ہے ۔

بھار والے تو بھوت پوچھیں گے
گھر کا بچہ ہے گھر کا زیور دیو
بھوت چیزاں نکو جی تھوڑے بس
ایک بنگلہ ہزار جوڑے بس

سلیمان خطیب کی زبان میں اب لڑکے والوں کی مجبوریاں ملاحظہ فرمائیں ۔

جوڑے لانا بھی راس نیں ہمنا
نتھ چڑھانا بھی راس نیں ہمنا
ہم ولیمہ تو کب بی دیتے نیں
کھانا وانا بھی راس نیں ہمنا
مہر و تاج جتی سنت ہے
بھوت بنا تو سب حماقت ہے

اس نظم کے آخری بند عبرت ونصیحت سے پر ہیں، سلیمان خطیب کہتے ہیں ۔

جس کی بچی جوان ہوتی ہے
اس کی آفت میں جان ہوتی ہے
بوڑھے ماں باپ کے کلیجے پر
ایک بھاری چٹان ہوتی ہے
جی میں آتا ہے اپنی بچی کو
اپنے ہاتھوں سے خود ہی دفنا دیں
لال جوڑا تو دے نہیں سکتے
لال چادر میں کیوں نا دفنا دیں

سلیمان خطیب مشاعروں میں پہلے پہل سامعین کو خوب ہنساتے اور پھر جب ان کا وار کارگر ہو جاتا تو وہ برائیوں اور ناعاقبت اندیشوں کی نشاندہی شروع کر دیتے جو اصلاحِ معاشرہ کے لیے ضروری تھا۔ واقعی خطیب نے نشتر زنی کا یہ کام صرف سنجیدگی سے لیا۔ ''دکنی ادب کے چار مینار'' میں رشید شکیب نے لکھا ہے کہ '' خطیب کی شاعری فطرت کی عکاس ہے، شاعر اپنے شاعرانہ اظہار کے لیے کسی کی طرف نہیں دیکھتا ، بلکہ وہ جس معاشرہ، جس دیس اور رسم ورواج کے ماحول میں پل رہا ہے اس سے استفادہ کرتا ہے، اسی لیے خطیب کی شاعری میں سچائی، حسن، معاشرتی مسائل اور سماجی الجھنوں کی نشاندہی ہوتی ہے، علاوہ ازیں تشبیہات، استعارات جابجا ملتے ہیں، یہی شاعری شاعر کو بلند مقام عطا کرتی ہے''۔

سلیمان خطیب کی شاعری میں طنز و مزاح

مزاح جس کی پسلی سے قہقہے جنم لیتے ہیں، غم واندوہ کے لیے تریاق کا کام کرتا ہے، یہ انسان کو مصائب اور تردّد سے نبرد آزما ہونے کا گر سکھاتا ہے، یہ فنکار کے لیے ایک ایسا آلہ ہے جو اس کے اظہارِ خیال میں معاون و مددگار ہے اور اس کی ذہنی کاوشوں کو رواں کرتا ہے، قہقہے اور ہنسی پیدا کرنے والا مزاح ہی انسان کو حقیقی لطف فراہم کرتا ہے۔ یونس فہمی اپنے مضمون بعنوان ''سلیمان خطیب ایک سنجیدہ شاعر'' میں تحریر کرتے ہیں:

'' خطیب قہقہوں کا شہنشاہ ہے، وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے باعث ایک انفرادی خصوصیت کا حامل ہے، وہ ابتداء قہقہوں کی کڑکتی ہوئی بجلیوں سے کام لیتا ہے اور پھر زندگی کی گھنگھور اور تاریک فضا کی سیر کراتا ہے، وہ ان رستے ہوئے ناسوروں کی نشاندہی کرتا ہے جو معاشرے کو کمزور اور نحیف بناتے جا رہے ہیں، وہ یہ سب کچھ خطیبانہ انداز میں نہیں کرتا، بلکہ لطیف مزاح کا سہارا بھی لیتا ہے''۔

سلیمان خطیب عزیز اللہ بیگ کی نظر میں طنز و مزاح کی حیثیت سے کہیں زیادہ بلند شاعر ہیں، وہ ایک ترقی پسند شاعر ہیں جو غریبوں، کسانوں، مزدوروں اور مفلوک الحال انسانوں کے بہتر مستقبل کے خواب دیکھتے تھے، وہ قلندرانی طبیعت کے مالک تھے اور لوگوں میں گھرے رہنا پسند کرتے تھے، اس وجہ سے ان کی شاعری میں ہمیں سماجی حقائق کی اس قدر کھری اور سچی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

یونس فہمی اپنے مذکورہ بالا مضمون میں سلیمان خطیب کے شعری مجموعہ ''کیوڑے کا بن'' کے مطالعہ کی روشنی میں لکھتے ہیں کہ '' واقعی خطیب کی شاعری میں مزاح، مقصدیت، افادیت، معنویت اور مقاصد کی کارفرمائی کثرت سے پائی جاتی ہے اور یہی دراصل حقیقی مزاح ہے، کیوں کہ مقصدیت کی نشتر زنی، افرادِ معاشرہ کے خیالات و رجحانات کو نفاست بخشتی ہے، طبائع انسانی کو پژمردگی سے نجات دلاتی ہے اور جینے کا سلیقہ بھی سکھاتی ہے، گویا مزاح سماج کے عمومی مسائل کی تطہیر کرتا

ہے، شائستگی اور شرافت کے انعامات سے نوازتا ہے، مزاح دراصل مہذب اور متمدن معاشرے میں قدرِ دوام کی حیثیت رکھتا ہے، مزاح نگار اعتدال پسند ہوتا ہے اور اس کی مقصدیت میں تفریح و تفنن کے بجائے کمزوریوں و کوتاہیوں کی نشاندہی ہوتی ہے، وہ نقاب پوش نہیں ہوتا، پہرہ دار ہوتا ہے۔ اس تناظر میں خطیب کی شاعری کو دیکھیں تو کہنا پڑتا ہے کہ خطیب صرف تبسم ہی کی نہیں، غور و فکر کی بھی دعوت دیتا ہے۔ وہ مسلمات یا مفروضۂ مسلمات پر نظرِ ثانی کی دعوت دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے''۔

پروفیسر یوسف رحمت زئی لکھتے ہیں: '' سلیمان خطیب نے مزاح کو طنز کی طرف موڑ کر وہی کام انجام دیا جو ایک عمدہ قسم کا سرجن یا جراح کرتا ہے، انہوں نے ماحول میں بکھرے ہوئے تمام زہر کو بوند بوند میں بند کیا، لیکن اس زہر پر مزاح کی شکر لپیٹ دی، آہستہ آہستہ شکر گھل جاتی ہے اور زہر کی تلخی روح کے اندر ایک کرب پیدا کر دیتی ہے، سلیمان خطیب کے ہاں مزاح میں پھکڑ پن نہیں، ایک نرم آہنگ ہے جو دلوں میں انبساط بھر دیتا ہے اور پھر طنز کی تلخیاں اس انبساط کو درد میں بدل دیتی ہیں، سلیمان خطیب کی شاعری کا یہ وصف انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گا''۔

یونس فہمی اپنے مضمون بعنوان ''سلیمان خطیب ایک سنجیدہ شاعر'' میں سلیمان خطیب کی ہجو گوئی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں: ''خطیب ہجویاتی اندازِ بیان اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی عضویاتِ انسان کی غیر معمولی اشکال کو نشانہ بناتے ہیں، لیکن جزوی طور پر کہیں کہیں خطیب آپے سے باہر بھی دکھائی دیتے ہیں اور انسان کے اعضائے بدن کی قدرتی یا حادثاتی عیوب کو ظاہر کر کے ہجو گوئی کے زمرے میں آجاتے ہیں، ان کی نظم ''کانا دجال'' اس کی بہترین مثال ہے''۔

سلیمان خطیب کی شاعری میں سنجیدگی

سلیمان خطیب سماج کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کرتے تھے اور پھر ان کی نشتر زنی کا کام ہنسی کی آڑ میں سنجیدگی سے لیا کرتے تھے، ان کی شاعری میں جدت بھی ہے اور ندرت بھی، وہ عوام کو ہنسا ہنسا کر بے دم کر دیتے تھے اور اس کے فوراً بعد غور و فکر پر مجبور بھی کر دیتے تھے۔ ان کے لیے یہ ضروری بھی تھا کہ وہ اپنی بات کہنے کے لیے طنز و مزاح کا سہارا لیتے، مان لیجیے اگر ان کی شاعری سے سنجیدہ کلام کو الگ کر دیا جائے تو ان کی شاعری کی دلکشی میں بڑی حد تک کمی واقع ہو جائے گی، مگر اس کے باوجود ان کا سنجیدہ کلام اپنے آپ میں مکمل اور مشن کی ترسیل میں کامیاب ہے۔ وہ مشاعروں میں جب بھی اپنی معرکۃ الآرا نظم '' ساس بہو'' سناتے اور دیہاتی ساس کے ڈائیلاگ نذرِ سامعین کرتے تو سامعین لوٹ پوٹ ہو جاتے، لیکن جب اسی نظم کے آخری بند کو شاعر بہو کی زبان میں پیش کرتا تو محفل کا رنگ یکسر بدل جاتا، وہ کہتے ہیں۔

ہم گھرانے کی شان رکھتے ہیں
بند مٹھی کی آن رکھتے ہیں
گھر کی عزت کا پاس ہے ورنہ
ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
بیٹی مریم ہے ، بیٹی زہرہ ہے
بیٹی سیتا ہے اور ساوتری
بیٹی عنوانِ درسِ عبرت ہے

یونس فہمی نے سلیمان خطیب کی سنجیدہ شاعری کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کی ان نظموں کی نشاندہی کی ہے جو

سنجیدگی اور متانت سے عبارت ہیں۔آیئے ہم بھی ان کے اس گراں قدر مطالعہ سے استفادہ کریں۔سلیمان خطیب کی بیشتر نظمیں خالص سنجیدہ ہیں، نظم ''درِخواجہ پہ چلو''، ''بارگاہِ بندہ نواز'' میں ایک پیام ہے، مندرجہ بالا دلیل کے ثبوت میں یہ نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں، ان نظموں کے علاوہ اور بھی کچھ نظمیں ایسی ہیں جن میں نہ تو مزاح کی چنگاریاں ہیں اور نہ طنز کے تیر۔ مذکورہ دونوں نظموں میں طنز و مزاح کی گنجائش ہی نہیں تھی، خطیب کی چند ایسی بھی نظمیں ہیں جن کے ابتدائی اشعار میں سنجیدگی اور متانت کے سوا کچھ بھی نہیں۔خطیب کی ایک نظم ''بشکولا'' ہے جو خالص طنزیہ نظموں میں شمار کی جاسکتی ہے، ان کی نظمیں ''پہلی جمعگی''، ''ہراج کا پلنگ'' اور ''پہلی تاریخ'' شاہکار نظمیں ہیں۔نظم ''سانپ'' میں بھی خطیب نے وہی تکنیک استعمال کی ہے جس کا رشتہ سنجیدگی سے جڑ جاتا ہے۔نظم ''روٹی'' میں خدا کا مکالمہ اور نظم ''راستے'' کے آخری اشعار خطیب کو ایک سنجیدہ شاعر سمجھنے پر مجبور کرتے ہیں۔''دو شاعر ایک رقاصہ'' اور ''پیارا وطن ہمارا'' پر مکمل طور پر سنجیدگی کی چھاپ ہے۔ان کی نظم ''پہلی جمعگی'' کے ابتدائی اشعار سنجیدگی سے عبارت ہیں، اس نظم میں شاعر نے لالچی ساس کی نفسیات کی بھرپور عکاسی کی ہے ۔

کیا دیا تھا نبی نے بیٹی کو
کچھ تو ہوگا بتول سے رشتہ
ایک چکی تھی اور مشکیزہ
صرف لفظِ قبول سے رشتہ
گھر نبی کا نبی کی بیٹی ہے
اور علی کا رسول سے رشتہ
اسی نقشِ قدم پہ چلنا ہے
تا ابد ہے رسول سے رشتہ

ان کی نظم ''تنگ پتلون'' کے مزاحیہ اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

ایک صاحب نماز میں یارو، تنگ پتلون چڑھا کر آئے تھے
اُنوں کھڑ کو تھے بس اقامت میں، لوگاں سجدہ میں سر جھکائے تھے

سلیمان خطیب کی نثری تخلیقات

سلیمان خطیب ایک عمدہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے، نثر نگاری میں بھی انہیں کمال حاصل تھا، اگر چہ نظم کی بہ نسبت ان کی نثری تحریروں کی تعداد بہت کم ہے، لیکن جو کچھ ہے بہت بہتر ہے، ان کی نمائندہ تحریروں میں مضامین بعنوان الیکشن کا موسم، کتاب پڑھنے کی تکنیک، آنکھیں، ماضی پر ایک نظر، خیریت اور گلبرگہ کلب کا ایک شاعر، میری زندگانی اور دروغ بیانی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔یہ مضامین اردو زبان و ادب کے مختلف جرائد و رسائل میں پھیلے ہوئے ہیں، جن میں سماجی اور معاشرتی مسائل کی بھرپور ترجمانی اور عکاسی ملتی ہے۔یہاں نمونے کے طور پر سلیمان خطیب کے ایک مضمون 'الیکشن کا موسم' کا ایک اقتباس نقل کیا جارہا ہے تا کہ اس سے ان کے اسلوبیاتی نہج کا پتہ چل سکے، اس اقتباس میں الیکشن کے موقع پر سیاست دانوں اور نام نہاد لیڈران کی دوڑ دھوپ، شعلہ بیان تقریر پھر اس میں بھلے مانوس لوگوں کو ترقی و خوشحالی کا پرفریب وعدہ وعید، روزی روزگار دلا کر ان کی دنیا بدل دینے کا جو سبز باغ دکھایا جاتا ہے۔اس پر انھوں نے دلچسپ پیرائے میں طنز کیا ہے۔آپ بھی اس اقتباس کا لطف اٹھایئے:

''اس موسم میں انسانی ہمدردی، بھائی چارگی جی اٹھتی ہے۔یہ تقریروں کا موسم ہے، اس موسم میں

دنیا کی طویل سے طویل تقریریں ہوتی ہیں۔قوم کی زبوں حالی اور ملک کے افلاس کے رقت آمیز مرثیے سنائے جاتے ہیں۔ ہرگلی کے موڑ پر ایک پٹرومکس کی روشنی میں سود وسوسا معین نہ ملیں تو صرف ایک دوراہ چلتوں کو پکڑ کر دھواں دھار تقریریں ہوتی ہیں۔مگر مچھ کے آنسو بہانے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ان تمام تقریروں کا خلاصہ اورلُبِّ لباب صرف یہی ہوتا ہے کہ ''مائی باپ! مجھے یا میرے امیدوار کو ووٹ دیجیے۔'' موقع پرست اور پیشہ ور مقررین کا یہ خاص موسم ہے۔یہ لوگ بریانی کھاتے ہیں، دودھ پیتے ہیں، پھول پہنتے ہیں،لونگ اور سعالین کھا کھا کر تقریریں کرتے ہیں، کبھی 'مرغ' کو تیار کرتے ہیں، کبھی 'ترازو' کو شہ دیتے ہیں۔یہ دونوں کے رازدار ہوتے ہیں، اسی لیے دونوں کو خوب لڑاتے ہیں اور اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں''۔

خلاصۂ کلام

سلیمان خطیب زمانے کے نبض شناس، مصلحِ قوم، ہمدردِ ملت اور اپنی تہذیب وثقافت کے نقیب تھے،انہوں نے اپنے کلام میں شعبہائے زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے، معاشرہ کے جس شعبہ میں بھی انہوں نے بے راہ روی دیکھی، بیباک انداز میں اسے موضوعِ سخن بنایا۔ارباب حل و عقد ہوں یا احبابِ علم ودانش، سماجی زندگی ہو یا انفرادی زندگی، مرد وزن کی نفسیات ہوں یا نت نئے سماجی ریت ورواج، سب کو اپنے دائرۂ گفتگو میں شامل کیا اور ان کی عکاسی کی۔یونس فہمی نے اپنے مضمون ''سلیمان خطیب ایک سنجیدہ شاعر'' میں سلیمان خطیب کی شاعری میں سنجیدگی کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ''ان کی اَن گنت نظمیں ایسی ہیں جن کا مطالعہ یہ محسوس کراتا ہے کہ ان کے دل میں قوم وملت کا درد موجود ہے، ان کے سینے میں ایک دردمند دل دھڑکتا ہے، ایک ایک لفظ سے دل کی آواز سنائی دیتی ہے جو پتھر دل کو موم بنا سکتی ہے۔خطیب نے معاشرتی بگاڑ کو نہایت دل پذیر انداز میں پیش کیا، ایسا لگتا ہے کہ وہ معاشرتی سدھار کا مشن لے کر اٹھے اور تنہا اس پر کام کرتے رہے، ان میں فنکارانہ صلاحیتیں بہت زیادہ تھیں اور یہ سب کچھ رب العزت کا گراں بہا عطیہ تھا''۔

حوالہ جات

۱۔ محمد خورشید عالم ندوی: کرناٹک کی ادبی شخصیات، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء۔

۲۔ ڈاکٹر سید بشیر احمد: مزاح نگارانِ حیدرآباد (حیدرآباد میں طنزیہ ومزاحیہ شاعری آزادی کے بعد)۔

۳۔ پروفیسر یوسف رحمت زئی : شاعری سچ بولتی ہے (مقالہ)، سیف قاضی کا بلاگ، ۲۰۱۳ء۔

۴۔ یونس فہمی : سلیمان خطیب ایک سنجیدہ شاعر (مقالہ)، روزنامہ سیاست (ادبی ڈائری)، حیدرآباد، ۲۰۱۴ء۔

۵۔ ڈاکٹر شمیم ثریا : سلیمان خطیب بین الاقوامی شہرت یافتہ طنزیہ ومزاحیہ شاعر (مقالہ)، وقارِ ہند ڈاٹ کوم۔

۶۔ منور سلطانہ: سلیمان خطیب (مقالہ)۔

۷۔ وہاب عندلیب: سلیمان خطیب شخص، شاعر اور نثر نگار۔

۸۔ سہ ماہی طنز ومزاح (سلیمان خطیب نمبر)، ج ۳، شمارہ ۱، جنوری۔مارچ ۲۰۱۲ء۔

لالہ خونیں کفن فلسطین - اردو شاعری میں

پروفیسر محمد عثمانی ندوی

غزہ پر اسرائیل کی جارحیت تمام حدود کو پار کر چکی ہے ۔ عرب حکومتوں کی نادانی اور مسلمانوں کے ضعفِ ایمانی کی وجہ سے مسجدِ اقصی کی بازیابی کا کام آج تک نہیں ہوسکا ہے۔ ایمان اگر طاقت ور ہو اور غیرت موجود ہو تو مقاومت اور معرکہ آرائی کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک قوم منزلِ مقصود تک نہیں پہونچ جاتی اور فتح مکمل نہیں ہوجاتی ہے۔ اسرائیل کے جنگی جرائم کی داستان خوں چکاں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ فلسطینیوں کے حوصلے پست کردیئے جائیں اور پھر تمام عرب ممالک کیا مصر و شام اور کیا پٹرول سے مالا مال عرب ملک سب کے سب بیکسی اور بے بسی اور شکست خوردگی کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ اور کچھ اس کے سوا نہیں کر سکتے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ یا اقوامِ متحدہ سے امن کے نام پر اپیل کریں۔

فلسطین کی بازیابی کی واحد راہ یہ ہے کہ ہم اقوامِ متحدہ، سلامتی کونسل، وہائٹ ہاؤس پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیں اور صرف اللہ پر بھروسہ کریں۔ ذوقِ یقین، شوقِ شہادت، باہمی اعتماد و اتحاد ہی وہ چیزیں ہیں جو کامیابی و فتح مندی کی کلید ہیں۔ ہمیں دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ فلسطین کے لیے صلاح الدین ایوبی جیسی کوئی شخصیت پیدا کردے جسے فلسطین پر غیروں کے قبضے کا ایسا غم تھا جیسے کسی کا اکلوتا بیٹا مر گیا ہو۔

عرب حکومتیں عیش و عشرت میں گرفتار اور ناگفتہ بہ حالات کا شکار ہیں۔ فلسطین کا زخم دل کا داغ اور سینے کا چراغ بن چکا ہے۔ شعرا جن کی طبیعتیں حالات سے جلد متاثر ہوتی ہیں، انھوں نے فلسطین کے قضیے پر بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ ہم یہاں چند نظموں کے اقتباسات پیش کریں گے جن سے اندازہ ہوگا کہ فلسطین کے قضیہ نے اردو شاعری پر کیا اثر ڈالا ہے۔

علامہ اقبال نے فلسطین کے عربوں سے مخاطب ہوکر ایک نظم کہی تھی:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تیری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

''خودی کی پرورش اور لذت نمود'' یہ ہے اقبال کے نزدیک مسئلۂ فلسطین کا حل۔ فلسطین کا مسئلہ جنیوا میں حل ہوسکتا ہے اور نہ لندن میں۔ اور نہ تل ابیب میں۔ اقبال نے ایک سے زیادہ مقامات پر مسئلۂ فلسطین کا تذکرہ کیا ہے اور اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انگریزوں کا اصل مقصد اسرائیل کی ریاست قائم کرکے عرب ملکوں کو مطیع اور زیرِ فرمان بنانا ہے۔ ورنہ اس دلیل میں کوئی وزن نہیں کہ ہزاروں سال پہلے یہاں یہودی رہا کرتے تھے۔ چنانچہ علامہ اقبال کہتے ہیں:

ہے خاکِ فلسطیں پر یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا

مقصد ہے ملوکیتِ افرنگ کا کچھ اور
قصہ نہیں تاریخ کا یا شہد و رطب کا

اسی طرح نظم ''تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سودخوار'' میں جو نیتشے کے زیرِ اثر لکھی گئی ہے، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام میں یہودی مہاجن بہت زیادہ طاقت ور ہیں، اور اس معاشی قوت کی وجہ سے سیاسی معاملات کی باگ ڈور بھی ان کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ مسئلۂ فلسطین پر علامہ اقبال نے جو بیان دیا تھا وہ اقبال نامہ میں موجود ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

''فلسطین میں یہود کے لیے ایک قومی وطن کا قیام تو محض ایک حیلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی ایمپریلزم مسلمانوں کے مقاماتِ مقدس میں مستقل انتداب اور سیادت کی شکل میں ایک مقام کی متلاشی ہے''۔

اقبال نے مسلمانوں کو بار بار قوت کے حصول کی نصیحت کی ہے۔ اقبال کے نزدیک کامیابی کسی کا پیدائشی حق نہیں ہے۔ کامیابی حاصل ہوتی ہے خودی کو طاقت ور بنانے سے، یقینِ محکم سے، علوم کی تحصیل سے، علم اشیا کی جہانگیری سے اور دنیوی قوتوں کی تسخیر سے۔

زندگی جہد است و استحقاق نیست
جز بہ علمِ انفس و آفاق نیست

اقبال نے اہلِ فلسطین کو خطاب کرتے ہوئے خودی کی پرورش اور ''لذتِ نمود'' کو امتوں کی ترقی اور آزادی و غلامی سے نجات کا ذریعہ قرار دیا۔

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

آخر یہ لذتِ نمود کیا چیز ہے؟ مٹی کی تاریکیوں سے تخم باہر نکل کر بتدریج ایک تناور درخت بنتا ہے۔ یہی لذتِ نمود ہے۔ نازک کلی چٹکتی ہے اور رنگین و شگفتہ پھول کی شکل اختیار کر لیتی ہے، یہی لذتِ نمود ہے۔ ایک طفلِ شیر خوار جو سہارے اور مدد اور دیکھ بھال کا محتاج ہوتا ہے، ایک دن تندرست و توانا اور مردِ قوی بن جاتا ہے، یہی لذتِ نمود ہے۔ ''خودی کی پرورش'' دراصل اپنی پوشیدہ اور خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے، ان کو درجۂ کمال تک پہنچانے اور فطرت کے منشا کے مطابق ان سے کام لینے کا نام ہے۔ خاک کا ایک ذرۂ بے مقدار قدموں کے نیچے پامال ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس کا جگر چیر کر اس کے جوہرِ خفتہ کو بیدار اور برسرِ کار کر دیا جائے تو اس سے طاقت کا وہ خزانہ دریافت ہوتا ہے جو زلزلہ افگن ہوتا ہے، اور چٹانوں کو چور کر دیتا ہے۔ اقبال نے غلامی سے نجات کا اور شوکت و عزت کی بازیابی کا یہی راستہ بتایا ہے۔

اب ہم یہاں فلسطین کے حوالے سے اردو کے کئی ایک دوسرے شعرا کے کلام کے اقتباسات پیش کریں گے۔ فلسطینیوں کے جہاد اور جنگِ آزادی پر فیض احمد فیض اس طرح سخن سرا ہوئے تھے:

ہم دیکھیں گے ، لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں ، روئی کی طرح اڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
جب ارضِ خدا کے کعبہ سے سب بت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا مزدورِ حرم مسند پر بٹھائے جائیں گے

سب تاج اچھالے جائیں گے سب تخت گرائے جائیں گے

ایک اور شاعر محمد ایوب بسمل کی فلسطین پر ایک طویل نظم ہے، جس کا پہلا بند یہ ہے:

کفر ہے برسرِ پیکار یہاں برسوں سے
گرم ہے ظلم کا بازار یہاں برسوں سے
امن ہے نقش بدیوار یہاں برسوں سے
حق عدالت میں سرِ دار یہاں برسوں سے
دے گئی تحفۂ نایاب تجھے جنگِ عظیم
کرگئی ارضِ مقدس کو بالآخر تقسیم

''اگلے کرسمس میں'' کے عنوان سے ف.س. اعجاز نے جو آزاد نظم کہی ہے، اس کا پہلا جز اس طرح ہے:

اس برس فلسطین کی سرزمین کے حق میں
سوگ میں شہیدوں کے
پیڑ سب کرسمس کے
سر سے پاؤں تک ننگے
چپکے چپکے روتے ہیں

معروف و مشہور شاعر رفعت سروش کی نظم ''اے ارضِ فلسطین'' کا آخری بند اس طرح ہے:

مظلوم بھی جاگ اٹھے ہیں یلغار کریں گے
دست حق و انصاف کے باطل سے لڑیں گے
کہہ دو یہ ممولوں سے کہ اب آتے ہیں شاہین
اے ارضِ فلسطین ! اے ارضِ فلسطین !

عائشہ مسرور نے ''نئی لوری'' کے عنوان سے فلسطین کے پس منظر میں یہ غم ناک نظم کہی ہے۔ خیمہ کے اندر ایک ماں اپنے بچے کو لوری سنا رہی ہے:

اے میرے نورِ عین! جاگ
اے میرے دل کے چین! جاگ
تیرا شفیق باپ تو جنگ میں کام آ گیا
تشنہ دہن کے ہاتھ میں موت کا جام آ گیا
دشت و دمن لہولہو
سارا وطن لہولہو
صحنِ چمن لہولہو
قوم بچھڑ کے رہ گئی
ساکھ بگڑ کے رہ گئی
مانگ اجڑ کے رہ گئی

فلسطین کے موضوع پر کوثر صدیقی نے نظم کہی ہے۔ نظم کے آخر میں اپنے شعری قلم سے یوں غم فشاں ہیں:

لا الہ کی تیغ سے ہی ہوسکا
مردِ مومن اندلس میں کامراں
لا الہ کا تیشہ پھر کر آبدار
لا الہ سے توڑ ہر بت کا گماں
لا الہ کی لے کے مشعل ساتھ چل
لوٹ لے ظلمت نہ رختِ کارواں
لا الہ کو چھوڑ کر ہے ناتواں
لا الہ کی ساتھ رکھ تیغ و سناں
لا الہ کی برقِ شعلہ بار سے
ختم اسرائیل کا کر آشیاں

معروف ادیب اور شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف نعیم صدیقی نے ''یروشلم'' کے عنوان سے بہت طویل نظم کہی ہے ، جس کے دو تین شعر حسبِ ذیل ہیں:

یروشلم یروشلم تو ایک حریمِ محترم
ترے ہی سنگِ در پر آج منہ کے بل گرے ہیں ہم
تجھے دیا ہے ہاتھ سے بزخمِ دل بچشمِ نم
یروشلم، یروشلم، یروشلم، یروشلم

اہلِ شعر و ادب قیصر الجعفری کے نام سے واقف ہیں۔ان کی نظم ''حریفِ جاں سے کہو'' کے چند اشعار بطورِ نمونہ پیشِ خدمت ہیں:

زمین بوجھ اٹھائے گی اور کتنے دن
تمام شہر ستم گروں کی زد پر ہے
ہزار بار جلاؤ ، ہزار بار مجھے
تمھاری شمع ازل سے ہوا کی زد پر ہے
تمام تیر مشیت کی چٹکیوں میں ہیں
کہیں بھی جائے پرندہ قضا کی زد پر ہے
لہو لہان شجر چیختے ہیں صدیوں سے
تمھاری تیشہ زنی بد دعا کی زد پر ہے
سمٹنے والا ہے کارو بارِ تیرہ شبی
تمھاری رات چراغِ حرا کی زد پر ہے
کھلیں گے مسجدِ اقصیٰ کے بند دروازے
تمھاری ساری خدائی خدا کی زد پر ہے

غزل

قمر جلال آبادی

تیرے خوابوں میں محبت کی دہائی دوں گا
جب کوئی اور نہ ہوگا تو دکھائی دوں گا

میری دنیا میں فقط ایک خدا کافی ہے
دوستو کتنے خداؤں کو خدائی دوں گا

دل کو میں قیدِ قفس سے تو بچا لے آیا
کب اسے قیدِ نشیمن سے رہائی دوں گا

کوئی انساں نظر آئے تو بلاؤ اس کو
اُسے اِس دور میں جینے پہ بدھائی دوں گا

دیکھ لوں اپنے گریباں ہی میں منہ ڈال کے میں
اپنے حالات کی کس کس کو برائی دوں گا

تم اگر چھوڑ گیے مجھ کو تو یوں تڑپوں گا
ساری دنیا کو غم و دردِ جدائی دوں گا

تیری ہی روح کا نغمہ ہوں اگر مٹ بھی گیا
میں تجھے دوسری دنیا سے سنائی دوں گا

غزل

قیصرالجعفری

چاندنی تھا، کہ غزل تھا کہ صبا تھا ؟ کیا تھا
میں نے اک بار ترا نام سنا تھا ......کیا تھا

گھر میں تو بھی تو نہیں جو کوئی برتن ٹوٹے
یہ جو کمرے میں ابھی شور ہوا تھا ...... کیا تھا

خودکشی کرکے بھی بستر سے اٹھا ہوں زندہ
میں نے کل رات میں جو زہر پیا تھا ......کیا تھا

اب کے بچھڑے ہیں تو لگتا ہے کہ کچھ ٹوٹ گیا
میرا دل تھا کہ ترا عہدِ وفا تھا ...... کیا تھا

ضد نہیں ہے کہ اسے تو بھی تعلق سمجھے
وہ جو اک دن مجھے دیوانہ کہا تھا ...... کیا تھا

تم تو کہتے تھے خدا تم سے خفا ہے قیصر!
ڈوبتے وقت جو اک ہاتھ بڑھا تھا...... کیا تھا

غزل

محمد عبدالرؤف خیر

وہ بات اور ہی ہے جو تمھیں سنانا ہے
سخن وری تو مری بات کا بہانہ ہے

ہمیں سنبھال کہ میں شاہکار کوزہ گری
ہماری خاک تری آگ سے توانا ہے

جو ایک دیو تھا سرکس کا شیر ٹھہرا ہے
ہوا کے ہاتھ میں یہ کیسا تازیانہ ہے

کوئی نشان لگاتے چلو درختوں پر
کہ اس سفر سے تمھیں لوٹ کے بھی آنا ہے

چلے جو ہم تو کسی نے وداع بھی نہ کیا
ملال یہ کہ ہمارا سفر سہانا ہے

سدا بہار ہے اس کے سخن کی ہریالی
وہ میرے واسطے موسم نہیں زمانہ ہے

مجھے تو چھوڑ کم از کم سنبھال تو خود کو
میں بے ٹھکانہ سہی ، کچھ ترا ٹھکانہ ہے

غزل تو جیسی بھی کہتا ہے وہ تو ظاہر ہے
رؤف خیر کا لہجہ تو شاعرانہ ہے

حرفِ آرزو (نظم)

گلنار آفریں

وہ محبتوں کی دنیا کہ جو خواب ہوگئی ہے
جو متاعِ زندگی تھی وہی ہم سے کھو گئی ہے

وہ یہیں کہیں پہ ہوگی انہی بام و در میں ہوگی
چلو آؤ ڈھونڈ لائیں وہ اسی نگر میں ہوگی

یہی سرزمیں تھی میری یہی آسماں تھا میرا
جو لٹا رہا تھا خوشبو یہی گلستاں تھا میرا

یہاں رنجشیں نہیں تھیں، یہاں سازشیں نہیں تھیں
یوں قدم قدم پہ بکھری کہیں نفرتیں نہیں تھیں

نہ تھی آدمی کی عظمت کبھی خاک وخوں میں غلطاں
نہ ہوا تھا زندگی کا کبھی یوں وقار ارزاں

نہ اُداس ہی تھے چہرے، نہ تھیں مضطرب نگاہیں
نہ تھیں مضمحل فضائیں، نہ تھیں خونچکاں ہوائیں

یہ تباہیوں کا عالم ، یہ ہلاکتیں مسلسل
یہی روز وشب کے جھگڑے، یہ قباحتیں یہ ہلچل

یہ ستم کی وارداتیں ، یہ عداوتیں کہاں تک
یہ الم کے تازیانے ، یہ حقارتیں کہاں تک

یہ دل و نظر کی پستی ، یہ ہوس کی حکمرانی
یہ قدم قدم پہ سودے ، یہ ہے آج کی کہانی

نہ اَنا کا کوئی گھر ہے، نہ ہے ذات کا ٹھکانہ
کوئی لکھ رہا ہے خوں سے مرے عہد کا فسانہ

رہِ زندگی میں آکر کبھی ہوسکے تو دیکھو
یہ فریبِ زندگی ہے جو سمجھ سکو تو سمجھو

جہاں زندگی ہو رقصاں مجھے وہ مکان دے دو
مجھے وہ زمین دے دو ، وہی آسمان دے دو

جو لُٹا رہا تھا خوشبو وہی گلستان دے دو
یہ صدائے زندگی ہے مجھے اب امان دے دو

افسانہ

لٹتے رہیں گے کب تک ..... ؟

حسین صحرائی

''نوید پولیس مقابلے میں مارا گیا'' یہ خبر پورے قصبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ جس نے سنا اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وجہ بھی معقول تھی۔ وہ انتہائی شریف اور اپنے کام سے کام رکھنے والا لڑکا تھا۔ فضول اور بے مقصد سیر و تفریح کے لیے نہ اس کے پاس پیسہ تھا نہ وقت۔ لوگ اپنے اپنے انداز میں اس خبر پر تبصرہ کر رہے تھے۔

''ہائے بے چاری آمنہ' لگتا ہے دکھ ہی کی گود میں جنم لیا اور دکھ ہی کے گہرے سمندر میں اپنی ننھی منی خواہش' جو اب کبھی پوری نہ ہو سکے گی' دل میں لیے کسی روز قبر میں جا بسے گی''، فضل محمد بولا' ''لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ صبر کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں!''

''ذرا یہ تو سوچو' وہ پولیس مقابلے میں کیسے اور کیوں مارا گیا؟ بھئی سچی بات یہ ہے کہ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔ لگتا ہے ضرور کوئی گڑبڑ ہے''۔ یہ بابا خورشید کی آواز تھی۔ بہت سوں نے اس کی تائید میں سر ہلائے تھے۔ ''آنے دو انتظار کرو' اور ہاں بھئی نور احمد باقی انتظام تو پورا ہے نا؟''

''ہاں بابا میں نے سب ہی بندوبست کر لیا ہے'' اس نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ وہ ضبط نہ کر سکا' آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے میلے دامن میں جذب ہو گیے۔

صحن میں بچھے ہوئے بوسیدہ میلے فرش پر عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کچھ قرآن خوانی میں مصروف تھیں اور کچھ خاموش بیٹھی آمنہ کو تک رہی تھیں۔ آمنہ کے بہتے آنسو اس کا غمِ دل بیان کرنے کے لیے کافی تھے۔ اک آگ تھی' حادثہ تھا' ایک سیلِ بادو باراں جو سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔ اب صرف اس کے نشان باقی تھے۔ اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ البتہ اس کی باتیں' معصوم خیالات اور خواہشات یادوں کی صورت میں باقی رہیں گی اور یہ سب کچھ آمنہ کو رلانے کے لیے کافی تھا۔

آمنہ کے پاس صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں بے سہاروں کے سب سے بڑے سہارے سے اپنے لیے تشفی کی دعا دل ہی دل میں مانگے جا رہی تھی۔ وہ جو ذہن کے گوشے میں جنم لینے والے ادنیٰ سے خیال سے بھی آگاہ رہتا ہے۔ بادِ بہاراں کے افق پر اسے کچھ دھندلے سے عکس لرزتے دکھائی دیتے۔ انسانی فطرت کے مطابق غم اور خوشی کے مواقع پر بیتے دن جو یاد آتے ہیں' سو وہ بھی انہی جاں گسل لمحات سے گزر رہی تھی۔ اس کے ذہن کے پردے پر ہلکی

سی شبیہ ابھری' وہ بہت چھوٹی سی تھی' اصل نام سے زیادہ گڑیا کہہ کر اسے پکارا جاتا تھا۔ زندگی کا سفر سست روی سے جاری تھا۔ موسم بدلتے تو چہروں پر کچھ دنوں کے لیے بہار آجاتی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ ہر طرف آگ اور خون تھا۔ لوگ مر رہے تھے۔ زخمیوں کی آہ و بکا نے ماحول پر سراسیمگی طاری کردی تھی۔ وہ اپنے والدین کے ہمراہ تیز تیز چل رہی تھی۔ باپ نے اسے گود میں اٹھالیا۔ اور وہ دونوں دوڑنے لگے۔ لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا۔ وہ ان کے نیچے دب کر رہ گئی۔ وہ بولتے ہی نہیں تھے۔ ننھی سی جان کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ رونے لگی۔ اک ہاتھ نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر اسے اپنی گود میں بھر لیا۔ آؤ بیٹا چلیں۔ اپنے پیاروں پر حسرت بھری نظر ڈالتے ہوئے وہ چل پڑے۔ کئی ہفتے تک وہ پھٹی پھٹی نظروں سے لوگوں کو تکتی رہتی۔ پھر قدرت نے اپنا کرم کیا اور وہ آہستہ آہستہ نارمل ہوتی گئی۔ خاموشی کو اس نے اپنا دوست بنالیا تھا۔

نعیم الدین نے' یہ نام اسے بعد میں معلوم ہوا' اسے ماں باپ کا پیار دے کر محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ وہ انھیں کس حالت میں اور کہاں ملی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کی طرح اسے چاہتے تھے۔ جوان ہونے پر اسے بڑے ہی چاؤ سے سلیم کے ساتھ رخصت کردیا۔ سلیم بہت ہی اچھا شوہر ثابت ہوا۔ وقت گزرتا رہا۔ پھر قدرت نے نوید کی شکل میں دونوں کی محبت کو مزید مستحکم کرنے کا سامان کردیا۔ نعیم الدین نانا ہوگئے اور سلیم ابو۔ آمنہ بہت ہی خوش تھی۔ کبھی کبھی وہ ماضی میں کھو جاتی تو بیتے دنوں کے زخم ہرے ہوجاتے تھے۔ خوف اور دہشت سے آنکھیں پھیل جاتی تھیں۔ اس موقع پر سلیم بڑی محبت سے اسے زندگی میں دلچسپی اور نوید کی تربیت کی طرف متوجہ کرتا۔ وہ تڑپ اٹھتی۔ نوید اس کی امنگوں کا محور بن چکا تھا۔

زندگی اور موت دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نعیم اللہ کو پیارا ہوا تو آمنہ کو محسوس ہوا' وہ تیز دھوپ میں آگئی ہے۔ سلیم نے اس تبدیلی کو محسوس کرکے پہلے سے زیادہ وقت دے کر یہ غم ہلکا کرنے میں مدد کی۔ زندگی سکون سے بسر ہو رہی تھی' موسم تبدیل ہو رہا تھا' درخت اپنے پتے جھاڑ رہے تھے' خزاں کی آمد تھی۔ یہ موسم ملک و قوم کے لیے بھی اچھا ثابت نہ ہوا۔ ہر روز نت نئی کہانیاں زباں زدِ عام تھیں۔ لوگوں کو زبان اور قومیت کے نام پر اکٹھا کرکے حقوق کے حصول کا مژدہ سنایا جارہا تھا۔ اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ ہر طرف گولیاں' زخمیوں کی آہ و بکا اور بے قصور لوگوں کی لاشیں گر رہی تھیں۔ ہر طرف موت کا بہیمانہ رقص جاری تھا۔ لوگ روزگار کی تلاش میں نکلتے اور شام تک جب لاشے واپس آتے تو رونے پیٹنے اور صبر کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔

سلیم اور آمنہ بھی اس صورتِ حال سے بڑے پریشان تھے۔ وہ دعا کرتے ''اے ربِ دوجہاں تو ہی سب کو ہدایت دے اور رحم کر''۔

ایک روز جب وہ ملازمت کے لیے گھر سے نکلا تو آمنہ نے اصرار کیا کہ وہ آج نہ جائے' شہر کے حالات اچھے نہیں ہیں۔

سلیم نے کہا ''ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو' لیکن کب تک گھر میں بیٹھا رہوں۔ کئی روز کے بعد تو آج جارہا ہوں۔ نوید کی فیس، گھر کا سامان..... یہ راشن پانی کا انتظام بھی تو کرنا ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو اور دعا کرو کہ اللہ خیریت رکھے۔

آمنہ نے بھری آنکھوں سے اسے رخصت کیا اور دل ہی دل میں اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی۔

رات ہو چکی تھی، سلیم کا کچھ پتہ نہ تھا۔ اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ اچانک تیز سیٹیوں کی آواز نے دل دہلا دیا۔ ایمبولینس گاڑی قصبے میں داخل ہوئی تو لوگ دوڑ پڑے۔ ''خیر تو ہے؟ کون زخمی ہے؟ کون......؟''

کچھ دیر بعد سلیم کی لاش اس کے سامنے ایمبولینس سے اتاری جا رہی تھی۔ اس کی دنیا اندھیر ہوگئی اور وہ چکرا کر دروازے میں گر گئی۔

آج پھر وہی منظر ہے......نعیم الدین اور سلیم کے بعد اب نوید......!

قصبہ تیز سیٹی کی آواز سے گونج اٹھا۔ پاس بیٹھی ہوئی عورت نے آمنہ کے کاندھے کو ہلاتے ہوئے کہا۔ بہن اٹھو شاید وہ آرہا ہے؟

وہ خالی خالی نظروں سے دروازے کو تک رہی تھی۔ باہر بیٹھے ہوئے سبھی مرد کھڑے ہوگیے تھے۔ ان کی متجسس نگاہیں ایمبولینس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

آفیسر آگے بڑھا ''اوئے کون وصول کرے گا اس کی لاش؟''

خورشید بابا آگے بڑھا ''جی حضور میں!''

آفیسر نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ''ابے تیرا رشتہ کیا ہے اس سے؟''

''جی وہ میرا بھانجا ہے۔''

بھانجا ...... ؟ ہونہہ!'' پولیس آفیسر نے مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''لیکن ہماری اطلاع کے مطابق اس کا کوئی رشتہ دار ہے ہی نہیں سوائے بیوہ ماں کے۔ تو کہاں سے پیدا ہوگیا ماما؟''

دوسرے پولیس اہلکار بھی طرح طرح کی باتیں کرتے رہے۔ پھر پولیس آفیسر اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہا اور اپنی چھڑی لہراتے ہوئے بولا

''اس کی ماں کو بلاؤ!''

خورشید بابا نے التجائی انداز میں کہا ''جی حضور میں نے کہا نا میں حاضر ہوں؟ ماں تو اس کی صدمے سے زندہ در گور ہو چکی ہے۔''

''صدمے سے نڈھال ہے تو کیا ہوا......؟ اگر وہ نہیں آسکتی تو ہم لاش واپس لے جاتے ہیں۔'' وہ شاید سارے تیر آزمانے پر تلا ہوا تھا۔

''حضور یہ ظلم نہ کیجیے، وہ پردہ دار خاتون ہے۔''

''پردہ پردہ، اوئے کان پک گیے ہیں؟ کہاں ہے پردہ اور کون کرتا ہے پردہ؟ مجھے تو کہیں نظر نہیں آتا، اگر اتنی ہی پردہ دار ہے تو کیوں......'' الفاظ کیا تھے، ایک برق تھی جو سب کے سینے جلا کر راکھ کر گئی۔ خورشید بابا کا صبر جواب دے گیا۔ اس نے آفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''تم اپنی حد سے بہت آگے بڑھ رہے ہو۔ وردی کے تقدس کو تو تم نے پامال کر ہی دیا ہے، انسانیت کی یہ تذلیل تمھیں بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔ ہمارے کمزور ہاتھ تیرا دماغ درست کر سکتے ہیں۔ ارے ظالم اس وردی پر مت اترا، یہ تو امانت ہے، مظلوم کی دادرسی کرنے کی، لیکن تو تو فرعون بن کر مسلسل ہمارا امتحان لے رہا ہے۔''

اندر صحن میں عورتوں تک بھی آواز جا رہی تھی۔ وہ یہ ساری باتیں سن رہی تھیں۔ ان میں آمنہ بھی شامل تھی۔ اس

کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور دروازے میں پڑا ہوا پردہ اٹھا کر باہر نکل آئی۔

''آفیسر' لے دیکھ اور سن ! میں ہوں اس مظلوم کی ماں۔ مجھے برہنہ سر دیکھنے کی تجھے بڑی خواہش تھی۔ لے اسے پورا کر' غور سے دیکھ تا کہ کوئی حسرت تیرے دل میں باقی نہ رہے''۔ آمنہ کی آواز بھرا گئی۔ پورے مجمع پر ایک سناٹا چھا گیا خورشید بابا نے آگے بڑھ کر آمنہ کو اندر لے جانا چاہا لیکن آمنہ نے اس کا ہاتھ روک دیا اور پولیس آفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''مجھے یہ بتا اس کا جرم کیا تھا؟ سلیم کا جرم کیا تھا؟''

وہ ہذیانی انداز میں اس کی جانب بڑھی۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔'' آفیسر سن اور سارے زمانے کو جا کر سنا۔ دہشت گرد نہ سلیم تھا نہ نوید' بلکہ تو ہے جو یہاں کھڑا لفظوں کی حرمت کو پامال کر رہا ہے۔ اور دہشت گرد وہ لوگ ہیں جنھوں نے ماؤں' بہنوں' بیٹیوں اور بزرگوں کی جان و مال وعصمت کا سودا کیا ہے۔ پھر اس پر اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کے بلند و بالا محل تعمیر کر کے ان میں جا بسے ہیں جیسے ان کا پیچھے رہ جانے والوں سے کوئی رشتہ ہی نہیں تھا؟ تو اور تیرے جیسے زر پرست ان کے محافظ ہیں۔ تم کبھی زبان' کبھی علاقے اور کبھی نسل کی بنیاد پر ظلم کرتے ہو۔ تبھی ہو جنھوں نے لوگوں کا سکون چھین لیا ہے۔ ان کی زندگیاں برباد کر دی ہیں۔ بول کس نے کس کے خلاف دہشت کی؟ میرے شوہر نے' میرے بیٹے نے' یا تم نے؟''

پولیس آفیسر حیران اور خاموش کھڑا سنتا رہا۔ آمنہ بولتی رہی اور پھر ایک دم بے جان سی ہو کر زمین پر بیٹھ گئی۔ پولیس آفیسر آمنہ کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ پھر خورشید بابا کی طرف بڑھا'

''یہاں دستخط کر دو''۔

''اس پر کیا لکھا ہے؟'' خورشید بابا نے پوچھا۔

''یہ بے قصور دو طرفہ فائرنگ میں مارا گیا ہے......''

خورشید بابا نے پولیس آفیسر کے ہاتھ سے قلم لیا اور خاموشی سے دستخط کر دیئے۔